جولائی ۱۹۶۵ء

جلد ۶۳ — عدد ۵

ماہنامہ

# ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

سالانہ چندہ ۷ روپے — قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

# اِصلاح و تربیّت کیلئے بے مثل کُتب

## راہ عمل

تالیف:- مولانا جلیل احسن ندوی

- مستند احادیثِ نبوی کا ایسا مختصر مجموعہ جو ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی میں رہنمائی کرے۔
- تعمیر سیرت کے لئے ایک بیش بہا خزینہ۔
- آفسٹ کی حسین طباعت۔ خوبصورت سرورق
- صفحات ۴۵۶ ہدیہ ۶/۰۰ روپے

## مُسلمان کے روز و شب

از:- اسعد گیلانی

- ایک مسلمان کی زندگی کے لئے مفصل لائحہ عمل۔
- پاکیزہ زندگی گذارنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب۔
- صحابہ کرام اور صلحاء امت کی پاکیزہ زندگیوں کا عکس۔
- مسنون دعائیں اور عبادات۔
- قیمت صرف ۳/۲۵ روپے

## قرآن کی چار بنیادی اِصطلاحیں

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- اللہ • رب • عبادت • دین
- قرآن کی ان اصطلاحات کا صحیح مفہوم اور —— ان کا انقلابی پہلو۔
- قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے ایک ناگزیر کتاب۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲/۲۵ روپیہ سستا ایڈیشن ۱/۲۵ روپیہ

## اذکارِ مسنونہ

تالیف:- علامہ حافظ ابنِ قیم رح

ترجمہ و حواشی:- مولانا خلیل احمد حامدی

- اس کتاب میں آپ کو اٹھتے۔ بیٹھتے، سوتے۔ جاگتے، سفر و حضر خلوت و جلوت ہر موقع کیلئے مسنون دعائیں ملیں گی۔
- بارگاہ الٰہی میں مستجاب۔ جامع۔ پُر اثر اور دل گداز دعاؤں کا مجموعہ۔
- آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت
- قسم اعلیٰ ۴/۰۰ روپے سستا ۲/۵۰ روپے

## دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات

از:- سید ابوالاعلیٰ مودودی - مولانا امین احسن اصلاحی - میاں طفیل محمد

- دعوت اسلامی اور اس کے تقاضے۔
- مسلمانوں کی موجودہ حالت کا تجزیہ
- اقامتِ صلوٰۃ کی غرض و غایت اور اہمیت
- دعوتِ اسلامی میں خواتین کا حصہ
- صفحات ۲۸۸ - آفسٹ کی حسین طباعت
- قیمت ۴/۰۰ روپے

## اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر

از:- مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- عبادت کا جاہلی اور اسلامی تصور۔
- اسلام میں عبادت کا حقیقی مقام۔
- انسانی زندگی پر عبادات کا اثر۔
- دین کا شعور حاصل کرنے کیلئے ایک بیش قیمت کتاب
- آفسٹ کی معیاری کتابت و طباعت
- قیمت ۱/۷۵ روپیہ

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

# فہرست مضامین

جلد ۶۳ | ماہ جولائی ۱۹۶۵ء | عدد ۵



دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور
۵-اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ، لاہور

سالانہ چندہ: سات روپے
قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

# اشارات

برِ عظیم ہند و پاکستان کی تقسیم جن حالات کے نتیجہ میں ہوئی اور تقسیم کے وقت جو حالات پیش آئے اُن کا تذکرہ بڑی دلفگار داستان ہے۔ لیکن اس تقسیم کے بعد اس برِ عظیم کے حالات درست ہو جانے کی توقع کی جا سکتی تھی اگر ہندو مسلم آویزش کے اس حل کو بھارت کے ہندو کھلے دل کے ساتھ قبول کر لیتے اور دیانتداری کے ساتھ ایک اچھے اور صلح پسند پڑوسی کی حیثیت سے رہتے۔ لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے پاکستان کے قیام کو خواہ مخواہ اپنی ناکامی سمجھ کر اپنے دل میں اس کے خلاف انتقام کی آگ بھڑکا رکھی ہے اور وہ ہر وقت اس کو نقصان پہنچانے کی تدابیر سوچتے رہتے ہیں۔ اس غیر معقول اور متعصبانہ طرزِ فکر میں بہت کچھ عمل دخل ہندو کی طبعی تنگ نظری کا بھی ہے۔ چنانچہ اس کے منتقمانہ جذبات کے شعلے آج اٹھارہ سال سے ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی بھڑک رہے ہیں، اور پاکستان کی سرحدوں پر بھی وقتاً فوقتاً بھڑکتے رہتے ہیں۔ یہ آگ کسی طرح فرو نہیں ہونے پاتی، کیونکہ ایک چھوٹا ظرف اور تنگ دل اسے اپنے اندر پرورش کیے چلا جا رہا ہے۔

---

ہندو صرف بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو ہی نہیں ستا رہے ہیں بلکہ انہوں نے پاکستان کے ساتھ ایک ایسا افسوسناک طرزِ عمل اختیار کر رکھا ہے جو سیاسی، اخلاقی اور معاشی، کسی اعتبار سے بھی صحیح نہیں۔ ایک طرف ریاستوں کے الحاق کے متعلق یہ اصول خود انہوں نے طے کیا تھا کہ کسی ریاست کے عوام جس طرف فیصلہ کریں، ریاست اُسی مملکت کے ساتھ شامل ہو گی،

اور اسی کو بنیاد بنا کر جونا گڑھ، اور حیدر آباد پر قبضہ کیا گیا۔ مگر دوسری طرف کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی غرض سے اس اصول کو انہوں نے خود ہی پس پُشت ڈال دیا اور اس کے بجائے یہ کہا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ عوام کے ہاتھ میں نہیں بلکہ وہاں کے حکمران کے ہاتھ میں ہے۔ اس غلط مفروضے کو بنیاد بنا کر انہوں نے کشمیر پر چڑھائی کر دی اور بالجبر ریاست کے سر سبز اور شاداب حصے پر قبضہ جما لیا۔ اہلِ کشمیر نے جب مدافعت کی اور پاکستان نے اس غیر اخلاقی طرزِ عمل پر احتجاج کیا تو بھارت نے اقوامِ متحدہ کے سامنے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ اس ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے مجاز صرف وہاں کے عوام ہیں۔ لیکن یہ وعدہ خلوص اور نیک نیتی پر مبنی نہ تھا۔ چنانچہ ریاست کو عوامی رائے کے علی الرغم محض جبر و تشدد کے زور سے بھارت میں مدغم کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ اس طرزِ عمل سے بھارت کا اخلاقی وقار بھی پست ہوا، اور پاکستان اور بھارت کے درمیان مفاہمت اور صلح کی فضا قائم ہونے کے بجائے اُلٹی مزید کشیدگی پیدا ہو گئی۔

---

اس صورتِ حال نے بھارت اور پاکستان کے درمیان مسلسل کھچاؤ پیدا کر رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب سے دونوں ملک معرضِ وجود میں آئے ہیں، ایک لامتناہی "سرد جنگ" جاری ہے۔ یہ جنگ اپنے نتائج کے اعتبار سے اصل جنگ سے کسی طرح کم تباہ کن نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ سے قوم کے اعصاب پر ہمیشہ ایک ناقابل برداشت دباؤ رہتا ہے جو اس کے قویٰ کو بالکل مضمحل بلکہ شل کر کے رکھ دیتا ہے۔ پھر نفرت کے جذبات پالنے کی وجہ سے چڑ، ضد، ہٹ دھرمی اور جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں کو کسی تعمیری کام پر نہیں لگا سکتی۔ اس کے علاوہ خوف و ہراس کی وجہ سے قوموں کے اندر خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ہراساں ہو کر بسا اوقات خود اپنے خلاف ایسی حرکات کر بیٹھتی ہیں جن کے بُرے نتائج انہیں صدیوں تک بھگتنے پڑتے ہیں۔ جرمنوں جیسی عظیم الشان

قوم کو اسی خوف کے جذبہ نے مخبوط الحواس بنا دیا اور اُس نے اپنی آزادی کا خود اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

---

بطنِ مستقبل میں کیا پنہاں ہے اس کے بارے میں کوئی بات بھی یقین کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ لیکن بھارت نے جو غیر دانشمندانہ روش اختیار کر رکھی ہے اُس سے اُسے اور پاکستان دونوں کو شدید نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اب عملاً صورتِ حال یہ ہے کہ دونوں ممالک جن کے ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرے معاشرتی اور تہذیبی روابط ہیں، جن کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ اور جنہوں نے آج سے ۱۸ سال پہلے ایک ہی مادرِ وطن کی کوکھ سے جنم لیا ہے، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں۔ پاکستان نے ہر مرحلے پر قابلِ تعریف ضبط اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا اور اس بات کی کوشش کی کہ حالات کو کسی طرح سنوارا جا سکے۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بھارت نے اپنی قوت و طاقت کے زعم میں پاکستان کی جائز شکایات کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی، بڑے غرور کے ساتھ وعدہ خلافیوں پر وعدہ خلافیاں کرتا چلا گیا اور کسی مرحلہ پر بھی صلح پسندی کا ثبوت نہ دیا۔ اُس کے اِس عاقبت نا اندیشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے پاکستان کے اندر تلخی کے جذبات پیدا ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دونوں ممالک کے درمیان اتحاد و اتفاق کے بجائے نفرت و حقارت کی فضا پائی جاتی ہے اور دونوں ممالک کی فوجیں ہتھیاروں سے مسلح ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ خدانخواستہ اگر جنگ چھڑ گئی تو دونوں ممالک کو شدید نقصان اٹھانا پڑے گا۔ دورِ جدید کی جنگ کو ماضی کی لڑائیوں پر قیاس نہ کرنا چاہیے جن میں صرف متحارب گروہ اپنی جوانمردی کے جوہر دکھاتے تھے۔ آج کی جنگ اپنے جلو میں تباہی اور بربادی کے طوفان لاتی ہے۔ یہ آگ ایک مرتبہ بھڑک اٹھے تو صرف فوجیں ہی اس کا ایندھن نہیں بنتیں بلکہ شہری آبادیاں بھی جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ پھر بسا اوقات

یہ آگ متحارب ملکوں سے آگے بڑھ کر پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

پاکستان اور ہندوستان دونوں ابھی آزاد ہوئے ہیں اور معاشی اعتبار سے سخت پسماندہ ہیں۔ اُن کے لیے اپنے آپ پر اس سے زیادہ کوئی ظلم نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی قومی دولت کا بیشتر حصّہ تعمیری کاموں پر صرف کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی بربادی پر صرف کرنے لگیں

---

پاکستان اپنے آپ کو خواہ مخواہ جنگ کی آگ میں جھونکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ آج بھی معقول اور باعزت شرائط پر ہندوستان سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار ہے، بشرطیکہ ہندوستان متنازع فیہ مسائل میں منصف مزاجی اور وسعتِ قلبی سے کام لے۔ پاکستان نے آج اگر اپنی فوجیں سرحدوں پر لا کر کھڑی کر دی ہیں تو یہ اُس نے قوت و طاقت کی نمائش یا جارحانہ عزائم کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ سخت مجبوری کے عالم میں کیا ہے۔ کیونکہ ہندوستان قوت کے نشے میں حق و انصاف کی ساری حدُود کو پامال کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اور پاکستان کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی ہے۔

---

گذشتہ دنوں مشرقی پاکستان میں طوفان سے جان و مال کا جتنا نقصان ہوا ہے اُس کا ابھی تک کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا۔ یہ باد و باراں کا طوفان نہ تھا بلکہ قیامت کا ایک ہولناک منظر تھا جس میں قریب قریب تیس ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے اور کئی لاکھ افراد بے خانماں ہو کر رہ گئے۔

اس قومی المیہ کا ایک دردانگیز پہلو یہ ہے کہ اس میں بھی حکومت نے "من و تو" کے امتیازات کو قائم رکھا ہے اور ملک کے سارے طبقوں سے امداد حاصل کرنے اور بحالی کے کام میں سب کا تعاون حاصل کرنے کے بجائے بعض جماعتوں کے معاملے میں بڑی

تنگدلی کا ثبوت دیا ہے۔ مصیبت کا وقت ایسا ہوتا ہے جس میں سارے اختلافات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے معاملے میں حکومت نے ان پُرآشوب حالات میں بھی اپنی روش میں کوئی تبدیلی پیدا کرنی پسند نہیں کی۔ وہ جو چاہے کرے اس معاملے میں وہ آزاد ہے۔ البتہ ہم اپنا فرض لازماً ادا کریں گے اور عوام سے بڑے زوردار الفاظ میں یہ اپیل کریں گے کہ وہ اپنے تباہ حال بھائیوں کی امداد کے کام میں زیادہ سے زیادہ مدد کریں تاکہ انہیں بحال کیا جا سکے۔

---

قاہرہ میں پی، آئی۔ اے کو جو اندوہناک حادثہ پیش آیا ہے وہ بھی بڑا دردانگیز ہے اس میں ملک کے قابل اور تجربہ کار صحافی اور دوسرے شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی بعض نامور شخصیتیں لقمۂ اجل ہوئی ہیں۔ پاکستان میں ان حضرات کی اچانک وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اُسے پُر کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اِلّا یہ کہ باری تعالیٰ غیب سے اسے پُر کرنے کے کوئی سامان پیدا کر دے۔ ان حضرات کی موت سے اُن کے پس ماندگان، خصوصاً اُن کے بیوی بچوں اور ضعیف والدین یا دوسرے ایسے متعلقین کو جن کا یہ لوگ سہارا تھے، جو شدید صدمہ اور نقصان پہنچا ہے، الفاظ اُس کے اظہار کے متحمل نہیں۔ اُن کے پسماندگان کی دل کھول کر مدد کرنی چاہیے تاکہ ان بدنصیب افراد کو اپنے ان عزیزوں کی وفات کا صدمہ برداشت کرنے کے ساتھ ساتھ افلاس اور فاقہ مستی کے مصائب نہ اٹھانے پڑیں۔ اُن کی موت کا دکھ ہی اُن کی زندگی کے باقی ایام کو تاریک بنانے کے لیے کافی ہے۔

---

مشرقی پاکستان کے تباہ حال افراد کی بحالی اور قاہرہ کے حادثہ کا شکار ہونے والے افراد کے پس ماندگان کی مدد کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے وہ کم ہے۔ لیکن روپیہ پیسہ جمع کرنے کے ساتھ ہمیں اُس مالک الملک کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ

پوری کائنات ہے۔ اور سوچنا چاہیے کہ کیا یہ حادثات ہمارے کسی قصور کی وجہ سے کسی بہت بڑی تباہی کا پیش خیمہ تو نہیں۔ یہ وقت ہے کہ ہم اپنے مالک کے حضور میں توبہ کریں، اپنے اخلاق کو بہتر بنائیں اور اُس عہد و پیمان کو یاد رکھیں جو ہم نے بحیثیت قوم اس ملک کی آزادی کے وقت اپنے خالق سے باندھا تھا، جسے ہم آہستہ آہستہ بھولتے چلے جا رہے ہیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ

---

جس طرح ہوا کے رُخ کا محض تنکوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح کسی فرد، معاشرے یا حکومت کے عزائم اور ارادوں کو جانچنے کے لیے بسا اوقات روزمرہ کے واقعات بڑی مدد دیتے ہیں۔ بلکہ واقعات جتنے غیر اہم ہوں اُسی نسبت سے وہ نیتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنی نیت کو دوسروں سے مستور رکھنا چاہتا ہے اور اس لیے وہ اسے جان بوجھ کر کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیتا لیکن دوسری طرف نیت، جو ہمارے قلب و دماغ کے ہر ریشے میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، اپنے اظہار کے لیے بیتاب رہتی ہے اور جس وقت بھی وہ انسان کے شعور کو غافل پاتی ہے، فی الفور لاشعور کے راستے سے غیر ارادی افعال و اعمال اور غیر شعوری الفاظ کے اندر چھپ کر باہر آجاتی ہے اور انسان کے بالمقابل کھڑے ہو کر بالکل اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی ہے: یہ ہے تمہاری اصل حقیقت!

---

نیت کا یہ باغیانہ کردار ظاہرداریوں کے سارے رنگین پردوں کے تار بکھیر کر رکھ دیتا ہے اور اس تضاد کا راز فاش کر دیتا ہے جو انسان کے ظاہری اعمال اور داخلی عزائم کے درمیان پایا جاتا ہے۔ نیت کے اس طرزِ عمل سے نہ صرف افراد بے نقاب ہوتے ہیں بلکہ کسی تہذیب کی باطنی کیفیات کا کھوج لگانے میں بھی اس سے مدد ملتی ہے اور ہم پر یہ حقیقت آشکارا

ہو جاتی ہے کہ افراد کی طرح بہت سی تہذیبیں بھی جو اپنی ظاہری چمک دمک میں ہمیں بڑی دلفریب دکھائی دیتی ہیں، باطن میں بڑی تاریک ہیں۔

---

دوسری تہذیبوں کو فی الحال نظر انداز کیجیے اور صرف مغربی تہذیب کے متضاد پہلوؤں کا جائزہ لیجیے تو آپ پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ آپ یہ دیکھیے کہ اس تہذیب میں انسان کی معاشی ترقی اور اس کی معاشرتی فلاح و بہبود پر کتنا زور صرف کیا جا رہا ہے، لیکن اس کی اخلاقی زندگی سے جس پر اُس کی فلاح کا، بلکہ اُس کی حیات کا دارومدار ہے، مجرمانہ تغافل برتا جاتا ہے۔ ایک طرف تو آسمانوں پر کمندیں ڈالنے کے عزائم ہیں مگر دوسری طرف انسانیت کو برباد کرنے کے لیے جوہری بم اور اسی نوعیت کے مختلف تباہ کن سامان تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس تہذیب کے اسی تضاد کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ سطحیت، اوچھا پن، لاف زنی اور فریب اس کے لازمی اجزا ہیں۔

---

اس تہذیب نے جن ممالک میں بھی قدم جماتے ہیں وہاں انسانیت کے حقیقی جوہر کو شدید نقصان پہنچا ہے اور انسانوں کی زیادہ تر صلاحیتیں ایسے کاموں میں ضائع ہوتی ہیں جو انسانیت کے لیے کسی لحاظ سے بھی مفید اور کارآمد نہیں۔

دُور نہ جائیے، ذرا پاکستان کے حالات پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں حکّام عالی مقام اور اُن کے چند وابستگان کے لیے ملک کے وسائل کس بے دردی سے صرف ہو رہے ہیں اور عوام کی حقیقی ضروریات پر کتنی توجہ دی جاتی ہے۔

کسی ملک میں انسان کی ایک بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اُس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا انتظام کیا جائے۔ مگر یہاں اس معاملے میں جو تغافل برتا جا رہا ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ قتل و غارت، ڈکیتی، اغوا ہماری زندگی کے معمولات بن گئے

ہیں اور انہیں روکنے کے لیے کوئی موثر تدبیر نہیں سوچی جاتی۔ انسانی قتل سے کہیں زیادہ انسانیت سوز اور بہیمانہ جرم معصوم بچوں کا اغوا ہے۔ ہو سکتا ہے پولیس اور فوج کی حفاظت میں رہنے والے حضرات کو اس جرم کی سنگینی اور اُس کے خوفناک نتائج کا احساس نہ ہو لیکن جن گھرانوں پر یہ افتاد پڑتی ہے اُن کے مصائب کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچہ اگر مر جائے تو والدین اور متعلقین کو کچھ مدت گزرنے کے بعد صبر آجاتا ہے لیکن بچے کا اغوا ایک ایسی چوٹ ہے جس کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے۔ بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک ایسی محرومی ہے جس کی یاد انسان کو قبر تک ستاتی ہے اور ہر گھڑی احساسِ غم میں شدت پیدا کرتی ہے ایسے بدنصیب انسان جیتے نہیں بلکہ محض سانس لیتے ہیں اور ان کا ہر سانس نالہ و فریاد ہوتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے جہلم کے سیشن جج نے اس گھناؤنے جرم کے ایک مرتکب کو پھانسی کی سزا کا حکم سناتے ہوئے اس انسانیت سوز فعل کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں:

> "بچے کا اغوا ایک ایسا جرم ہے جس کی سنگینی قتل سے کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ اس سے بچے اور اس کے والدین کو تاحینِ حیات شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے"
>
> (پاکستان ٹائمز، ۱۱ رجون ۶۵ء)

فاضل جج کے یہ الفاظ بالکل صحیح اور درست ہیں۔ ایک شخص کو جب قتل کیا جاتا ہے تو اسے ایک مرتبہ ہی انتہائی تکلیف اور درد کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جو بدنصیب بچہ اغوا کیا جاتا ہے جب تک زندہ رہتا ہے اس وقت تک اُس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں اُن کی ہڈیوں کو توڑ کر اور اُن کے جسموں کو داغ کر انہیں ایسی قابلِ رحم حالت میں بازار میں لایا جاتا ہے کہ لوگوں کے دل انہیں دیکھتے ہی پسیج جائیں اور وہ اُن پر رحم کھا کر زیادہ سے زیادہ خیرات دیں۔ اخبارات میں اکثر ایسی خبریں بھی شائع ہوئی ہیں کہ یہ معصوم بچے ظالموں کے دردناک عذاب کو برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے دم توڑ دیا۔ پھر بچیوں کو جس قسم کی ہولناک ہوس کاریوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے اُس کے تصور سے ہی جسم پر لرزہ طاری

ہو جاتا ہے۔ یہ جرائم ایسے نہیں جو اکا دکا نگاہوں کے سامنے آئیں۔ یہ ہماری زندگی کے معمولات بن چکے ہیں۔ کوئی اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، آپ کو اُس کے ایک صفحہ پر ہی اس قسم کے متعدد رُوح فرسا واقعات کا تذکرہ ملے گا۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ حکومت جسے اپنی استعدادِ کار، اپنی قابلیت اور قوم کے ساتھ غیر معمولی محبت پر بڑا ناز ہے، وہ آخر اس سنگین جُرم کے قلع قمع کے لیے کیوں مُؤثر قدم نہیں اٹھاتی۔ ہم اُسے اتنا بے بس نہیں پاتے جس حکومت کی پولیس سیاسی کارکنوں کی معمولی سے معمولی حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور اُن کی ہر نقل و حرکت سے ہمیشہ باخبر رہتی ہے .. اُس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اِن سماج دشمن عناصر کی سرگرمیوں سے غافل ہو گی۔ جو حکومت اپنی کرسیوں کی حفاظت کے لیے اتنی چوکس رہتی ہے اور اس کے لیے پوری قوت صرف کرتی ہے، اُسے لوگوں کے دُکھ درد اور انسانی جان کے احترام کا واقعی احساس ہو تو اُس کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کر کے ننھی مُنّی کلیوں کا تحفظ مشکل نہیں ہے۔ مگر اس معاملے میں جس افسوسناک بے پروائی کا ثبوت دیا جا رہا ہے اس کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ حکومت کی نظر میں اس ظلم کی وہ اہمیت نہیں ہے جو درحقیقت ہونی چاہیے۔ جو حکومت سمندر کی تہ میں سے سونا برآمد کر سکتی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ان ظالموں کا کھوج لگانے میں ناکام ہو جائے جو انسانیت کے غارت گر ہیں۔

---

حکومت کا یہ طرزِ عمل بھی اُس خاص طرزِ فکر کا نتیجہ ہے جو مغربی تہذیب نے پیدا کر رکھا ہے۔ اس طرزِ فکر کے مطابق کسی معاشرے میں بنیادی اہمیت انسان کے بجائے سرمائے کو حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ہماری سوسائٹی کی توجہ کے مرکز اور معاشرے سے ہر قسم کی مراعات اور خدمات کے مستحق وہ لوگ ہیں جو صاحبِ سیم و زر ہیں۔ جو اقتدار کے تخت پر متمکن ہیں، جن کے ہاتھوں میں ملک کی زمامِ کار ہے۔ رہے وہ لوگ جو ثروت کی آنکھ سے مستور جھونپڑیوں میں رہتے ہیں اُن کے دُکھ درد، اُن کے مصائب اور ان کی پریشانیوں سے حکومت کو کوئی سروکار

نہیں۔ اُن کے ساتھ سماج دشمن عناصر جو ظلم و زیادتی بھی کریں اُسے عام معمول سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور انتظامیہ اُن کے بچوں کے اغوا کے تدارک کے لیے اتنی سرگرمی بھی نہیں دکھاتی جتنی کہ اصحابِ اختیار کے کتوں اور دیگر جانوروں کی حفاظت میں دکھاتی ہے۔

ہم اس ملک کے اربابِ بست و کشاد سے یہ مؤدبانہ التماس کرتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اپنے بچوں سے اپنی محبت کا جائزہ لیں اور اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیں کہ اگر خدانخواستہ وہ کبھی اس ہولناک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں تو اُن پر کیا بیتے گی۔ اولاد خواہ امیر والدین کی ہو یا غریب والدین کی، اپنے ماں باپ کے لیے وہ دل کے ٹکڑے ہی ہوتے ہیں۔ اُن پر جب کبھی اس قسم کی وحشتناک افتاد پڑتی ہے تو انہیں زندہ درگور بنا دیتی ہے۔ یہ کوئی سیاسی مسئلہ نہیں جس کے بارے میں کوئی اختلاف ہو۔ یہ خالص انسانیت کا مسئلہ ہے۔ انسانی ہمدردی کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس کی طرف پوری توجہ صرف کرنی چاہیے اور اس کے اس پہلو کو نظر انداز کر دینا چاہیے کہ اس میں کتنی محنت صرف ہو گی۔ اگر اس ظلم کا تدارک کر لیا گیا تو دنیا میں جتنی نیک نامی حاصل ہو گی، اور دکھی دلوں سے اہلِ اقتدار اور انتظامیہ کے حق میں جو دعائیں نکلیں گی، ان کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ اس کام کے لیے ملک کے سربراہوں کو اجرِ عظیم عطا کرے گا۔ ان حضرات کی یہ کارگزاری اس حقیقت کی شہادت دے گی کہ انہیں انسانیت سے وابستگی ہے اور وہ انسانی مسائل کو شہرت و ناموری کی خاطر نہیں بلکہ اخلاص اور ہمدردی سے حل کرنے کے لیے بیتاب ہیں۔

---

یورپ اس وقت جس اخلاقی گراوٹ کا شکار ہے اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ وہاں کے رہنے والوں کے دلوں سے احساسِ زیاں بھی آہستہ آہستہ رخصت ہو رہا ہے اور اُن کی بدکرداریوں کو قانون کی پشت پناہی حاصل ہوتی رہی ہے۔ وہاں انحطاط کا انداز یہ رہا ہے کہ پہلے کسی اخلاقی برائی نے جنم لیا اور اُس نے معاشرے کے رگ و پے میں سرایت

کرنا شروع کر دیا۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر جب عوام ذرا مضطرب ہوئے تو وہاں کے اہلِ دانش اس بُرائی کے خلاف آواز بلند کرنے اور لوگوں کو اس سے متنفر کرنے کے بجائے اُس کی تائید و حمایت پر کمربستہ ہو گئے اور اُسے فطرت کے عین مطابق ثابت کرنے کے لیے باطل دلائل کا ایک انبار لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ لوگوں کے دلوں میں اُس کے متعلق جو خلش موجود تھی وہ ختم ہو گئی اور اس کے بعد قانون کے ذریعہ اُسے جائز بنا دیا گیا۔

---

صحبتِ ہم جنس (عملِ قومِ لُوط) کا مرض جس تشویشناک سرعت کے ساتھ امریکہ اور یورپ میں بڑھ رہا ہے وہ انسانیت کے لیے ایک خطرناک چیلنج کا حکم رکھتا ہے اور اس نے تہذیب کی بنیادوں تک کو ہلا دیا ہے لیکن داد دیجیے مغربی حکماء اور اہلِ خرد اور اہلِ بصیرت کی کہ انہوں نے اس کے تدارک کے لیے کوئی مؤثر قدم اٹھانے کے بجائے اسے عقل اور قانون دونوں کی سند عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس رفتار سے لوگ اس قبیح اور خلافِ فطرت فعل کے عادی ہوتے اسی جذبے اور ولولے کے ساتھ مغربی مفکرین اسے فطری فعل ثابت کرنے میں اپنی قوتیں کھپانے لگے۔ انہوں نے کہا چونکہ اس فعل کا انسان صدیوں سے ارتکاب کرتا چلا آ رہا ہے اس لیے یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو جرم انسانیت کے اندر مدتِ دراز سے موجود ہو وہ جرم نہیں رہتا بلکہ عین نیکی بن جاتا ہے۔ ان حضرات نے اس جرم کے معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے یہ کہنا شروع کیا کہ جو شخص اس کا ارتکاب کرتا ہے وہ درحقیقت ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہے اس لیے وہ سزا کا مستوجب نہیں بلکہ طبیب اور ڈاکٹر کی ہمدردی کا مستحق ہے۔ ان اہلِ دانش کے افکار میں نہایت واضح منطقی مغالطہ اور بڑا کھلا تضاد ہے۔ انگلستان میں جو کمیٹی اس جرم کے معاشرتی اور قانونی پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے قائم ہوئی تھی اُس کے ایک معزز رکن آدیر نے بڑے واضح الفاظ میں ان کے اس غلط طرزِ فکر کی نشاندہی کی ہے۔ اُس نے کہا کہ

"اگر ایک فرد کے معاملے میں آپ اتنی ہمدردی کی تلقین کر رہے ہیں تو آپ کو پورے معاشرے کی فلاح و بہبود کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ یہ فعل پوری معاشرتی زندگی کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے اور اس کا قوم کے اجتماعی اخلاق پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ ممکن ہے ہر مجرم ذہنی اعتبار سے مریض ہی ہو لیکن اگر ہر مجرم کو اسی بنا پر کھلی چھوٹ دے دی جاتے تو اس سے پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔"[1]

---

اس کمیٹی نے قانون میں تغیر کے لیے جو سفارشات پیش کیں ان پر ہر طرف سے بڑی لے دے ہوئی۔ لیکن اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں اور اس کے حامیوں نے کسی معقول سے معقول بات کی طرف بھی توجہ نہ دی اور قوم کے اجتماعی ضمیر کو اس بات پر مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ یہ بالکل ایک فطری فعل ہے کیونکہ انسان کے اندر اس کی خواہش پائی جاتی ہے۔ اس لیے معاشرے کو اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔

البتہ انہوں نے ایک "عنایت" یہ ضرور کی کہ اس فعل کے جواز پر کچھ شرائط عائد کر دیں۔ ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا ارتکاب کھلے بندوں نہ کیا جائے۔ اور دوسری یہ کہ دونوں فریق بالغ ہوں اور وہ آپس میں رضامند ہوں تاکہ اجتماعی مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ یہ شرائط انتہائی مضحکہ خیز ہیں۔ جرم بہرحال جرم ہی ہے خواہ اسے عوام الناس کے سامنے کیا جائے یا اسے لوگوں کی نظروں سے چھپ کر کیا جائے۔ اور اس کے اثرات ہر دو صورتوں میں فرد اور معاشرے پر پوری طرح مرتب ہوتے ہیں۔

جرم درحقیقت انسانی ضمیر سے بغاوت کا نتیجہ ہے۔ جس ماحول میں بھی یہ کیا جائے انسان کی انسانیت کو مسخ کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کا مرتکب آہستہ آہستہ ان ساری حدود

---

[1] PEPORT OF THE COMMITTE ON HOMOSEXUAL OFFENCES & PROSTITUION. P. 116

کو توڑتا چلا جاتا ہے جو انسان اس پر عائد کرتا ہے۔

---

جس اخلاق کا سرچشمہ خوفِ خدا اور فکر آخرت نہ ہو اس میں کبھی بھی استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی حشر اس صحبتِ ہم جنس جیسے گھناؤنے جرم کا بھی ہوا۔ "پرائیویٹ" کی شرط پر بڑی جرح ہوئی اور اس کے صحیح حدود متعین نہ کیے جا سکے۔ بعض نے کہا یہ شرط بڑی احمقانہ ہے۔ جب اس فعل کو ایک فطری فعل تسلیم کر لیا جاتا ہے تو پھر اس پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا شخصی آزادی میں بیجا مداخلت ہے جس کی کسی حکومت کو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ پھر بالغ کی شرط کا بھی خوب مذاق اڑایا گیا اور یہ کہا گیا کہ جب ایک فرد اس فعل کے لیے رضامند ہے اور اس کے نتائج کو برداشت کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہے تو حکومت کو اس کے معاملے میں دخیل ہونے کا کوئی حق نہیں۔

خالص منطقی نقطۂ نظر سے ان دلائل میں کوئی سقم معلوم نہیں ہوتا۔ اگر آپ انسانی زندگی کو پرائیویٹ اور پبلک حصوں میں تقسیم کر کے کسی شخص کو اس بات کی اجازت دیتے ہیں کہ وہ اپنی شخصی زندگی میں جو چاہے کرے تو پھر آپ اس سے کسی مقام پر بھی باز پرس نہیں کر سکتے۔ شخصی اور اجتماعی زندگی کی سرحدیں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ان کے درمیان کوئی خطِ امتیاز نہیں کھینچا جا سکتا۔ ایک شخص اپنی انفرادی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے وہ لازمی طور پر پوری اجتماعی زندگی کو متاثر کرتا ہے، اور اسی طرح وہ اپنی حیاتِ اجتماعی میں جس طرز عمل کو اختیار کرتا ہے اُس کی شخصی زندگی اُس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس قسم کے غلط اور بے بنیاد فلسفوں نے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے بجائے اُن کے اندر مزید پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا کیا ہے۔ جس گندگی کو بھی کسی فرد کی انفرادی اور شخصی زندگی میں گوارا کیا گیا اُس نے بالآخر پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سوسائٹی نے اُس کے خلاف نبرد آزما ہونے کی بجائے پہلے اُسے ایک حقیقی ضرورت ثابت کیا اور پھر اُسے بسروچشم قبول

کر لیا۔ ابھی چند روز ہوئے انگلستان کی پارلیمنٹ میں صحبتِ ہم جنس کو قانونی جواز دینے پر جو بحث ہوئی وہ اس غلط طرزِ فکر کی ہر لحاظ سے آئینہ دار ہے۔ ایوان کے ایک رکن آران نے اس قبیح فعل کو قانونی طور پر جائز قرار دینے کے لیے جو تقریر کی اس کے مندرجہ ذیل اقتباسات قابلِ غور ہیں:

"بعض اعداد و شمار کے مطابق انگلستان میں دس لاکھ افراد یعنی ہر ۲۵ میں سے ایک شخص اس گناہ میں ملوّث ہے۔ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو اس سے باز رکھیں تو یہ اُن کے لیے ایک ناروا پابندی ہے۔ اور اگر وہ اس کا ارتکاب کریں تو وہ تعزیر کی زد میں آتے ہیں۔ انسان کی بنیادی خواہشات یا اُس کی نفسیات کو بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر وہ فطری طور پر صحبتِ ہم جنس کی طرف مائل ہے تو وہ اس کا ارتکاب کرتا رہے گا۔ ایسے حالات میں اس کو سزا دینا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں۔ یہ اقلیت پر ظلم و ستم ہے۔ اُسی نوعیت کا ظلم و ستم جو یہودیوں اور حبشیوں پر ڈھایا گیا۔" (پاکستان ٹائمز۔ مئی ۱۹۶۵ء)

اس کارروائی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مذہبی رہنما اور سیرت و اخلاق کے سب سے بڑے علمبردار یعنی چرچ کے سب سے اونچے نمائندے آرچ بشپ آف کنٹربری، جن سے اس طرزِ فکر کی شدید مخالفت کی توقع تھی، انہوں نے بھی اس کی حمایت میں تقریر کی اور اسے قانونی جواز عطا کرنے کا فتویٰ دیا۔ اُن کے مندرجہ ذیل الفاظ کتنے عبرت انگیز ہیں اور انسانیت اور اخلاق کے مستقبل کے بارے میں کتنا تاریک تصور پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا:

"میری دانست میں بالغوں کے درمیان صحبتِ ہم جنس اگر رضامندی سے ہو تو یہ قرینِ عقل و انصاف ہے اور اس بنا پر میں قانون کے اندر مناسب تبدیلیوں کے حق میں ہوں۔"

اسی ماہ کے آغاز میں راولپنڈی میں گورنروں کی جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں رشوت ستانی کے متعلق بھی غور و خوض کیا گیا اور اس کے تدارک کے لیے ایک اعلیٰ اختیارات کی کمیٹی کے قیام کی سفارش کی گئی جو سرکاری افسروں کے کام کی نگرانی کرتی رہے۔ یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ اربابِ اختیار کو اس امر کا احساس تو ہوا ہے اور اس کی روک تھام کے لیے انہوں نے چند تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ لیکن ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی نگاہیں بُرائی کے اُس سرچشمے کی طرف نہیں گئیں جس سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ رشوت ستانی، اقربا نوازی، خیانت، قتل و غارت، اغوا، ڈاکہ، بدمعاملگی یا اسی طرح کی دوسری بُرائیاں سب ایک ہی چشمہ سے پھوٹتی ہیں اور وہ چشمہ ہے خدا سے غفلت جب تک انسان کے اندر یہ احساس پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی علیم و بصیر ذات ہماری دلی کیفیات اور ہمارے پوشیدہ اور ظاہری سارے اعمال کو دیکھ رہی ہے اس وقت تک ہمارے اندر دیانت اور امانت کا صحیح شعور بیدار نہیں ہو سکتا دل کی انجان گہرائیوں میں ابھرنے والے معصیت آلود خیالات اسی چشم ہمہ بین کے احساس سے دب سکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی قوم کا اجتماعی مزاج اور عدالت کے تادیبی قوانین ایک حد تک انسانی اعمال کو خاص حدود کا پابند بناتے ہیں۔ لیکن صرف ان کی جکڑ بندیاں انسان کو خیر پر قائم رکھنے کے لیے ناکافی ہیں۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ DAY LIGHT MORALITY "اجالے کا اخلاق" پیدا ہو سکتا ہے جو اپنے اندر کے اعتبار سے سلبی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر فطری طور پر گناہ اور جرم سے بچنے کی امنگ پیدا نہیں ہوتی بلکہ ماخوذ ہونے کے اندیشے، اور قانونی شکنجے اور احتساب کے خوف سے وہ بُرائی سے باز رہتا ہے ظاہر بات ہے کہ اخلاق کی جو عمارت اس قسم کی کمزور بنیادوں پر استوار ہوگی وہ کبھی مضبوط نہیں ہو سکتی۔ حقیقی اور پائیدار اخلاق صرف ایمان باللہ ہی سے جنم لیتا ہے، یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خبیر ہستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کے حضور میں بالآخر انسان کو پیش ہو کر اپنے ہر چھوٹے اور بڑے عمل کا حساب دینا ہے۔

# تفہیم القرآن

## الدُّخان

### (۲)

اچھا، انتظار کرو اُس دن کا جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا، یہ ہے دردناک سزا۔ (اب کہتے ہیں کہ) "پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں"۔ اِن کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ اِن کے پاس رسولِ مُبین آ گیا[۱۱] پھر بھی یہ اُس کی طرف مُلتفت نہ ہوئے اور کہا کہ "یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"[۱۲]۔ ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے

---

[۱۱] رسولِ مُبین کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا رسول ہونا اُس کی سیرت، اُس کے اخلاق و کردار اور اُس کے کارناموں سے بالکل عیاں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے حقیقت کو کھول کھول کر بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

[۱۲] اُن کا مطلب یہ تھا کہ یہ بے چارا تو سیدھا سادھا آدمی تھا، کچھ دوسرے لوگوں نے اِسے بھروں پر چڑھا لیا، وہ درپردہ قرآن کی آیتیں گھڑ گھڑ کر اِسے پڑھا دیتے ہیں، یہ آ کر عام لوگوں کے سامنے اُنہیں پیش کر دیتا ہے، وہ مزے سے بیٹھے رہتے ہیں، اور یہ گالیاں اور پتھر کھاتا ہے۔ اِس طرح ایک چلتا ہوا فقرہ کہہ کر وہ اُن ساری دلیلوں اور نصیحتوں اور سنجیدہ تعلیمات کو اڑا دیتے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برسوں سے اُن کے سامنے پیش کر کر کے تھکے جا رہے تھے۔ وہ نہ اُن معقول باتوں پر کوئی توجہ کرتے تھے جو قرآن مجید میں بیان کی جا رہی تھیں۔ نہ یہ دیکھتے تھے کہ جو شخص یہ باتیں پیش کر رہا ہے وہ کس پائے کا آدمی ہے۔ اور نہ یہ الزام رکھتے وقت ہی وہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا کرتے تھے کہ ہم یہ کیا بکواس

کر رہے تھے۔ جس روز بڑی ضرب لگے گی وہ دن ہوگا جب ہم تم سے انتقام لیں گے۔[۱۳]

کر رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص درپردہ بیٹھ کر سکھانے پڑھانے والا ہوتا تو وہ حضرت خدیجہؓ اور ابوبکرؓ اور علیؓ اور زیدؓ بن حارثہ اور دوسرے ابتدائی مسلمانوں سے آخر کیسے چھپ جاتا جن سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب، اور ہر وقت کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ یہی لوگ سب سے بڑھ کر حضور کے گرویدہ اور عقیدت مند تھے، حالانکہ درپردہ کسی دوسرے شخص کے سکھانے پڑھانے سے نبوت کا کاروبار چلایا گیا ہوتا تو یہی لوگ آپ کی مخالفت میں سب سے پیش پیش ہوتے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۷۳-۵۷۴۔ جلد سوم، ص ۴۳۵-۴۳۷)

۱۳؎ اِن آیات کے مفہوم میں مفسرین کے درمیان بڑا اختلاف واقع ہوا ہے اور یہ اختلاف خود صحابہ کرام کے زمانے میں بھی پایا جاتا تھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور شاگرد مسروق کہتے ہیں کہ ایک روز ہم کوفے کی مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک واعظ لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا ہے۔ اس نے آیت یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ پڑھی، پھر کہنے لگا، جانتے ہو یہ کیسا دھواں ہے؟ یہ دھواں قیامت کے روز آئے گا اور کفار و منافقین کو اندھا بہرا کر دیگا، مگر اہل ایمان پر اس کا اثر بس اس قدر ہوگا کہ جیسے زکام لاحق ہوگیا ہو۔ اس کی یہ بات سن کر ہم حضرت عبداللہ بن مسعود کے پاس گئے اور ان سے واعظ کی یہ تفسیر بیان کی۔ حضرت عبداللہ لیٹے ہوئے تھے۔ یہ تفسیر سن کر گھبرا کے اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے کہ آدمی کو علم نہ ہو تو اسے جاننے والوں سے پوچھ لینا چاہیے۔ اصل بات یہ ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام قبول کرنے سے انکار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہی چلے گئے تو حضورؐ نے دعا کی کہ خدایا یوسف علیہ السلام کے قحط جیسے قحط سے میری مدد فرما۔ چنانچہ ایسا شدید کال پڑا کہ لوگ ہڈیاں اور چمڑا اور مردار تک کھا گئے۔ اس زمانے میں حالت یہ تھی کہ جو شخص آسمان کی طرف دیکھتا تھا اسے بھوک کی شدت میں بس دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ آخرکار ابوسفیان نے آکر حضورؐ سے کہا کہ آپ تو صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ کی قوم بھوکوں مر رہی ہے۔ اللہ سے دعا کیجیے کہ اس مصیبت کو دور کر دے۔ یہی زمانہ تھا جب قریش کے لوگ کہنے لگے تھے کہ خدایا ہم پر سے

یہ عذاب دُور کر دے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ اسی واقعہ کا ذکر ان آیات میں کیا گیا ہے۔ اور بڑی ضرب سے مراد وہ ضرب ہے جو آخر کار جنگِ بدر کے روز قریش کو لگائی گئی۔ یہ روایت امام احمد، بخاری، ترمذی، نسائی، ابنِ جریر اور ابن ابی حاتم نے متعدد سندوں کے ساتھ مسروق سے نقل کی ہے۔ اور مسروق کے علاوہ ابراہیم نخعی، قتادہ، عاصم اور عامر کا بھی بیان ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے اس آیت کی یہ تفسیر ارشاد فرمائی تھی۔ اس لیے اس امر میں کوئی شک نہیں رہتا کہ حضرتِ موصوف کی رائے فی الواقع یہی تھی۔ تابعین میں سے مجاہد، قتادہ، ابوالعالیہ، مُقاتل، ابراہیم النَّخَعی، ضَحّاک اور عطیۃ العوفی وغیرہ حضرات نے بھی اس تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے اتفاق کیا ہے۔

دوسری طرف حضرت علی، ابنِ عمر، ابن عباس، ابوسعید خُدری، زید بن علی اور حسن بصری جیسے اکابر کہتے ہیں کہ ان آیات میں سارا ذکر قیامت کے قریب زمانے کا کیا گیا ہے اور وہ دھواں جس کی خبر دی گئی ہے، اُسی زمانے میں زمین پر چھائے گا۔ مزید تقویت اِس تفسیر کو اُن روایات سے ملتی ہے جو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ حُذَیفہ بن اَسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک روز ہم قیامت کے متعلق آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اتنے میں حضور برآمد ہوئے اور فرمایا قیامت قائم نہ ہو گی جب تک دس علامات یکے بعد دیگرے ظاہر نہ ہو لینگی: سُورج کا مغرب سے طلوع ہونا۔ دھواں۔ دآبّہ۔ یاجوج وماجوج کا خروج۔ عیسٰیؑ ابن مریمؑ کا نزول۔ زمین کا دھنسنا مشرق میں، مغرب میں اور جزیرۃ العرب میں۔ اور عدَن سے ایک آگ کا نکلنا جو لوگوں کو ہانکتی ہوئی لے جائے گی (مسلم)۔ اسی کی تائید ابو مالک اشعری کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابنِ جریر اور طبرانی نے نقل کیا ہے، اور ابوسعید خُدری کی روایت جسے ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوئیں کو علاماتِ قیامت میں شمار کیا ہے، اور یہ بھی حضورؐ نے فرمایا ہے کہ وہ دھواں جب چھائے گا تو مومن پر اس کا اثر صرف زکام جیسا ہو گا، اور کافر کی نَس نَس میں وہ بھر جائے گا اور اس کے ہر مَنفذ سے نکلے گا۔

اِن دونوں تفسیروں کا تعارض اوپر کی آیات پر غور کرنے سے بآسانی رفع ہو سکتا ہے۔

جہاں تک حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تفسیر کا تعلق ہے، یہ امرِ واقعہ ہے کہ مکہ معظمہ میں حضورؐ کی دعا سے سخت قحط رونما ہوا تھا جس سے کفار کے چھکے بہت کچھ ڈھیلے پڑ گئے تھے، اور انہوں نے اسے رفع کرانے کے لیے حضورؐ سے دعا کی درخواست کی تھی۔ اس واقعہ کی طرف قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اشارے کیے گئے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۴۰۔ جلد دوم، ص ۵۹-۶۰-۲۶۹-۲۷۰-۲۷۷-۲۷۸-جلد سوم، ص ۲۹۳)۔ اِن آیات میں بھی صاف محسوس ہوتا ہے کہ اشارہ اُسی صورتِ حال کی طرف ہے۔ کفار کا یہ کہنا کہ "پروردگار، ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے، ہم ایمان لاتے ہیں" اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ "ان کی غفلت کہاں دُور ہوتی ہے جبکہ ان کے پاس رسولِ مبین آگیا، پھر بھی یہ اُس کی طرف ملتفت نہ ہوئے اور کہا کہ یہ تو سکھایا پڑھایا باؤلا ہے"۔ پھر یہ فرمانا کہ "ہم ذرا عذاب ہٹائے دیتے ہیں، تم لوگ پھر وہی کچھ کرو گے جو پہلے کر رہے تھے"۔ یہ ساری باتیں اسی صورت میں راست آسکتی ہیں جبکہ واقعہ حضورؐ ہی کے زمانے کا ہو۔ قیامت کے قریب ہونے والے واقعات پر ان کا اطلاق بعید از فہم ہے۔ اس لیے اس حد تک تو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر ہی صحیح معلوم ہوتی ہے لیکن اُس کا یہ حصہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "دھواں" بھی اُسی زمانے میں ظاہر ہوا تھا، اور اس شکل میں ظاہر ہوا تھا کہ بھوک کی شدت میں جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں ہی دھواں نظر آتا تھا۔ یہ بات قرآن مجید کے ظاہر الفاظ سے بھی مطابقت نہیں رکھتی، اور احادیث کے بھی خلاف ہے۔ قرآن میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ آسمان دھواں لیے ہوئے آگیا اور لوگوں پر چھا گیا۔ وہاں تو کہا گیا ہے کہ "اچھا تو اُس دن کا انتظار کرو جب آسمان صریح دھواں لیے ہوئے آئے گا اور وہ لوگوں پر چھا جائے گا"۔ بعد کی آیات کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو اس ارشاد کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب تم نہ رسول کے سمجھانے سے مانتے ہو، نہ قحط کی شکل میں جو تنبیہ تمہیں کی گئی ہے اُس سے ہی ہوش میں آتے ہو، تو پھر قیامت کا انتظار کرو، اُس وقت جب پوری طرح شامت آئے گی تب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ حق کیا تھا اور باطل کیا تھا۔ پس جہاں تک دھوئیں کا تعلق ہے، اس کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ وہ قحط کے زمانے کی چیز نہیں ہے بلکہ علاماتِ

ہم اِن سے پہلے فرعون کی قوم کو اِسی آزمائش میں ڈال چکے ہیں۔ اُن کے پاس ایک نہایت شریف رسول[14] آیا اور اس نے کہا[15] اللہ کے بندوں کو میرے حوالے کرو[16]، میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں[17]۔ اللہ کے مقابلے میں سرکشی نہ کرو۔ میں تمہارے سامنے (اپنی

قیامت میں سے ہے، اور یہی بات احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ تعجب ہے کہ مفسرین کبار میں سے جنہوں نے حضرت ابنِ مسعود کی تائید کی انہوں نے پوری بات کی تائید کر دی، اور جنہوں نے ان کی تردید کی انہوں نے پوری بات کی تردید کر دی، حالانکہ آیات اور احادیث پر غور کرنے سے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ اس کا کونسا حصہ صحیح ہے اور کونسا غلط۔

۱۴؎ اصل میں "رسولِ کریم" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ کریم کا لفظ جب انسان کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ بہترین شریفانہ خصائل اور نہایت قابلِ تعریف صفات سے متصف ہے۔ معمولی خوبیوں کے لیے یہ لفظ نہیں بولا جاتا۔

۱۵؎ یہ بات ابتدا ہی میں سمجھ لینی چاہیے کہ یہاں حضرت موسیٰ کے جو اقوال نقل کیے جا رہے ہیں وہ ایک وقت میں ایک ہی مسلسل تقریر کے اجزا نہیں ہیں، بلکہ سالہا سال کے دوران میں مختلف مواقع پر جو باتیں انہوں نے فرعون اور اس کے اہلِ دربار سے کہی تھیں ان کا خلاصہ چند فقروں میں بیان کیا جا رہا ہے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۶۳ تا ۷۴، ۳۰۱ تا ۳۱۰۔ جلد سوم، ص ۹۵ تا ۱۰۸، ۴۸۰ تا ۴۹۸، ۵۵۷ تا ۵۶۰۔ ۶۳۴ تا ۶۳۹۔ جلد چہارم، المومن آیات ۲۳ تا ۴۶۔ الزخرف ۴۶ تا ۵۶ مع حواشی)

۱۶؎ اصل میں اَدُّوْا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اِن کا ایک ترجمہ تو وہ ہے جو اوپر ہم نے کیا ہے اور اس کے لحاظ سے یہ اُس مطلب کا ہم معنی ہے جو سورۂ اعراف (آیت ۱۰۵)، سورۂ طٰہٰ (۴۷) اور الشعراء (۱۷) میں گزر چکا ہے کہ "بنی اسرائیل کو میرے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دو"۔ دوسرا ترجمہ، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے منقول ہے، یہ ہے کہ "اللہ کے بندو میرا حق ادا کرو" یعنی میری بات مانو، مجھ پر ایمان لاؤ، اور میری ہدایت کی پیروی کرو، یہ خدا کی طرف سے تمہارے اوپر میرا حق ہے۔

ماموریت کی) صریح سند پیش کرتا ہوں[۱۸]۔ اور میں اپنے رب اور تمہارے رب کی پناہ لے چکا ہوں اِس سے کہ تم مجھ پر حملہ آور ہو۔ اگر تم میری بات نہیں مانتے تو مجھ پر ہاتھ ڈالنے سے باز رہو[۱۹]۔"

بعد کا یہ فقرہ کہ "میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں" اِس دوسرے مفہوم کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

۱۷؎ یعنی بھروسے کے قابل رسول ہوں۔ اپنی طرف سے کوئی بات ملا کر کہنے والا نہیں ہوں۔ نہ اپنی کسی ذاتی خواہش یا غرض کے لیے خود ایک حکم یا قانون گھڑ کر خدا کے نام سے پیش کرنے والا ہوں۔ مجھ پر تم یہ اعتماد کر سکتے ہو کہ جو کچھ میرے بھیجنے والے نے کہا ہے وہی بے کم و کاست تم تک پہنچاؤں گا۔ (واضح رہے کہ یہ دو فقرے اُس وقت کے ہیں جب حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے اپنی دعوت پیش فرمائی تھی)۔

۱۸؎ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے مقابلے میں جو سرکشی تم کر رہے ہو یہ دراصل اللہ کے مقابلے میں سرکشی ہے، کیونکہ میری جن باتوں پر تم بگڑ رہے ہو وہ میری نہیں بلکہ اللہ کی باتیں ہیں اور میں اُسی کے رسول کی حیثیت سے انہیں بیان کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں اس میں شک ہے کہ میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں یا نہیں، تو میں تمہارے سامنے اپنے مامور من اللہ ہونے کی صریح سند پیش کرتا ہوں۔ اِس سند سے مراد کوئی ایک معجزہ نہیں ہے، بلکہ معجزات کا وہ طویل سلسلہ ہے جو فرعون کے دربار میں پہلی مرتبہ پہنچنے کے بعد سے آخر زمانۂ قیامِ مصر تک حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون اور اس کی قوم کو سالہا سال تک دکھاتے رہے۔ جس سند کو بھی اُن لوگوں نے جھٹلایا اُس سے بڑھ کر صریح سند آپ پیش کرتے چلے گئے۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الزُّخرف حواشی نمبر ۴۲-۴۳)۔

۱۹؎ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حضرت موسیٰ کی پیش کردہ ساری نشانیوں کے مقابلے میں فرعون اپنی ہٹ پر اڑا ہوا تھا مگر یہ دیکھ کر کہ اِن نشانیوں سے مصر کے عوام اور خواص روز بروز متاثر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اُس کے ہوش اُڑے جا رہے تھے۔ اُس زمانے میں پہلے تو اُس نے بھرے دربار میں وہ تقریر کی جو سورۂ زخرف، آیات ۵۱-۵۳ میں گزر چکی ہے (ملاحظہ ہو حواشی سورۂ زخرف ۴۵ تا ۴۹)۔ پھر زمین پاؤں تلے سے نکلتی دیکھ کر آخر کار وہ اللہ کے رسول کو قتل کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اُس

آخر کار اُس نے اپنے رب کو پکارا کہ یہ لوگ مجرم ہیں[۲۰]۔ (جواب دیا گیا) "اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو[۲۱] لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا[۲۲]۔ سمندر کو اُس کے حال پر کُھلا چھوڑ دے۔ یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے[۲۳]"۔ کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل تھے جو وہ چھوڑ

---

وقت آنجناب نے وہ بات کہی جو سورۂ مومن، آیت ۲۷ میں گزر چکی ہے کہ اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّکُمْ مِّنْ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤْمِنُ بِیَوْمِ الْحِسَابِ "میں نے پناہ لی اپنے رب اور تمہارے رب کی ہر اس متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا"۔ یہاں حضرت موسیٰ اپنی اُسی بات کا حوالہ دے کر فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت سے فرما رہے ہیں کہ دیکھو، میں تمہارے سارے حملوں کے مقابلے میں اللہ ربّ العٰلمین سے پناہ مانگ چکا ہوں۔ اب تم میرا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ لیکن اگر تم خود اپنی خیر چاہتے ہو تو مجھ پر حملہ آور ہونے سے باز رہو۔ میری بات نہیں مانتے تو نہ مانو۔ مجھ پر ہاتھ ہرگز نہ ڈالنا، ورنہ اس کا بہت بُرا انجام دیکھو گے۔

۲۰؎ یہ حضرت موسیٰ کی آخری رپورٹ ہے جو انہوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی۔ "یہ لوگ مجرم ہیں" یعنی ان کا مجرم ہونا اب قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے۔ کوئی گنجائش ان کے ساتھ رعایت برتنے اور ان کو اصلاحِ حال کا مزید موقع دینے کی باقی نہیں رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ حضور آخری فیصلہ صادر فرمائیں۔

۲۱؎ یعنی اُن سب لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں۔ ان میں بنی اسرائیل بھی تھے، اور مصر کے وہ قبطی باشندے بھی جو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے حضرت موسیٰ کی آمد تک مسلمانوں میں شامل ہو چکے تھے، اور وہ لوگ بھی جنہوں نے حضرت موسیٰ کی نشانیاں دیکھ کر اور آپ کی دعوت و تبلیغ سے متاثر ہو کر اہلِ مصر میں سے اسلام قبول کیا تھا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۴۲۰)

۲۲؎ یہ ابتدائی حکم ہے جو حضرت موسیٰ کو ہجرت کے لیے دیا گیا تھا۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، ص ۱۰۸-۴۹۳ تا ۴۹۸)

۲۳؎ یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب حضرت موسیٰ اپنے قافلے کو لے کر سمندر پار اُتر چکے تھے اور چاہتے

گئے۔ کتنے ہی عیش کے سروسامان، جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا اُن کا انجام، اور ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔[۲۴] پھر نہ آسمان اُن پر رویا نہ زمین،[۲۵] اور ذرا سی مہلت بھی ان کو نہ دی گئی۔ ع اس طرح بنی اسرائیل کو ہم نے سخت ذلّت کے عذاب، فرعون[۲۶] سے نجات دی جو حد سے گزر جانے والوں میں فی الواقع ع

تھے کہ سمندر پر عصا مار کر اُسے پھر ویسا ہی کر دیں جیسا وہ پھٹنے سے پہلے تھا، تاکہ فرعون اور اس کا لشکر اُس راستے سے گزر کر نہ آجائے جو معجزے سے بنا تھا۔ اس وقت فرمایا گیا کہ ایسا نہ کرو۔ اس کو اسی طرح پھٹا کا پھٹا رہنے دو، تاکہ فرعون اپنے لشکر سمیت اِس راستے میں اُتر آئے، پھر سمندر کو چھوڑ دیا جائیگا اور یہ پوری فوج غرق کر دی جائے گی۔

۲۴ حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے قومِ فرعون کے بعد مصر کی سرزمین کا وارث بنا دیا۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد دوسرے لوگ ہیں جو آلِ فرعون کے بعد مصر کے وارث ہوئے، کیونکہ تاریخوں میں کہیں بھی یہ ذکر نہیں ملتا کہ مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کبھی وہاں واپس گئے ہوں اور اس سرزمین کے وارث ہوئے ہوں۔ یہی اختلاف بعد کے مفسّرین میں بھی پایا جاتا ہے۔ (تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۴۹۶-۴۹۷)

۲۵ یعنی جب وہ حکمراں تھے تو اُن کی عظمت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اُن کی حمد و ثنا کے ترانوں سے دنیا گونج رہی تھی۔ خوشامدیوں کے جمگھٹے اُن کے آگے اور پیچھے لگے رہتے تھے۔ ان کی وہ ہوا باندھی جاتی تھی کہ گویا ایک عالم اُن کے کمالات کا گرویدہ اور ان کے احسانات کا زیر بار ہے اور ان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی مقبول نہیں۔ مگر جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان کے لیے رونے والی نہ تھی، بلکہ دنیا نے ایسا اطمینان کا سانس لیا کہ گویا ایک کانٹا تھا جو اس کے پہلو سے نکل گیا۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے نہ خلقِ خدا کے ساتھ کوئی بھلائی کی تھی کہ زمین والے ان کے لیے روتے، نہ خدا کی خوشنودی کا کوئی کام کیا تھا کہ آسمان والوں کو ان کی ہلاکت پر افسوس ہوتا۔ جب تک مشیّتِ الٰہی سے ان کی رسّی دراز ہوتی رہی، وہ زمین کے سینے پر مونگ دلتے رہے۔ جب ان کے جرائم حد سے گزر گئے تو اس طرح اٹھا کر

بڑے اونچے درجے کا آدمی تھا،[۲۷] اور اُن کی حالت جانتے ہوئے اُن کو دنیا کی دوسری قوموں پر ترجیح دی،[۲۸] اور انہیں ایسی نشانیاں دکھائیں جن میں صریح آزمائش تھی[۲۹]۔

یہ لوگ کہتے ہیں "ہماری پہلی موت کے سوا اور کچھ نہیں، اُس کے بعد ہم دوبارہ اُٹھائے جانے والے نہیں ہیں[۳۰]۔ اگر تم سچّے ہو تو اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو"۔ یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی

پھینک دیئے گئے جیسے کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا ہے۔

۲۶۔ یعنی فرعون بجائے خود اُن کے لیے ذلّت کا عذاب تھا اور دوسرے تمام عذاب اسی ایک عذابِ مجسّم کے شاخسانے تھے۔

۲۷۔ اِس میں ایک لطیف طنز ہے کفّارِ قریش کے سرداروں پر۔ مطلب یہ ہے کہ حدِ بندگی سے تجاوز کر جانے والوں میں تمہارا مرتبہ اور مقام ہی کیا ہے۔ بڑے اونچے درجے کا سرکش تو وہ تھا جو اُس وقت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے تخت پر خدائی کا روپ دھارے بیٹھا تھا۔ اسے جب خس و خاشاک کی طرح بہا دیا گیا تو تمہاری کیا ہستی ہے کہ قہرِ الٰہی کے آگے ٹھیر سکو۔

۲۸۔ یعنی اُن کی خوبیاں اور کمزوریاں، دونوں اللہ پر عیاں تھیں۔ اُس نے بے دیکھے بھالے اُن کا انتخاب اندھا دھند نہیں کر لیا تھا۔ اُس وقت دنیا میں جتنی قومیں موجود تھیں اُن میں سے بنی اسرائیل کو جب اُس نے اپنے پیغام کا حامل اور اپنی توحید کی دعوت کا علمبردار بنانے کے لیے چُنا تو اس بنا پر چُنا کہ اُس کے علم میں وقت کی موجود قوموں میں سے وہی اِس کے لیے موزوں تر تھے۔

۲۹۔ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اول، ص ۷۵ تا ۸۶ - ۱۵۴ تا ۲۲۴ - ۵۸ تا ۴۶۱ - جلد دوم، ص ۷۴ تا ۹۵ - جلد سوم ۱۱۱ تا ۱۲۱ -

۳۰۔ یعنی پہلی دفعہ جب ہم مریں گے تو بس فنا ہو جائیں گے، اس کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔ "پہلی موت" کے الفاظ سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُس کے بعد کوئی دوسری موت بھی ہو۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کے ہاں پہلا بچہ پیدا ہوا تو اس قول کے صادق ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ اس کے بعد لازماً دوسرا بچہ پیدا ہو، بلکہ صرف یہ کافی ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی بچّہ نہ ہوا ہو۔

قوم اور اس سے پہلے کے لوگ؟ ہم نے اُن کو اسی بنا پر تباہ کیا کہ وہ مجرم ہو گئے تھے۔[۳۳] یہ آسمان و زمین اور اِن کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنا دی ہیں۔ اِن کو

۳۱؎ ان کا استدلال یہ تھا کہ ہم نے کبھی مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ جی اٹھتے نہیں دیکھا ہے، اس لیے ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہوگی۔ تم لوگ اگر دعویٰ کرتے ہو کہ دوسری زندگی ہوگی تو ہمارے اجداد کو قبروں سے اٹھا لاؤ تاکہ ہمیں زندگی بعد موت کا یقین آجائے۔ یہ کام تم نے نہ کیا تو ہم سمجھیں گے کہ تمہارا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ یہ گویا اُن کے نزدیک حیات بعد الموت کی تردید میں بڑی پختہ دلیل تھی۔ حالانکہ سراسر مہمل تھی۔ آخر ان سے یہ کہا کس نے تھا کہ مرنے والے دوبارہ زندہ ہو کر اسی دنیا میں واپس آئیں گے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم یا کسی مسلمان نے یہ دعویٰ کب کیا تھا کہ ہم مُردوں کو زندہ کرنے والے ہیں؟

۳۲؎ تُبّع قبیلۂ حِمیَر کے بادشاہوں کا لقب تھا، جیسے کسریٰ، قیصر، فرعون وغیرہ القاب مختلف ممالک کے بادشاہوں کے لیے مخصوص رہے ہیں۔ یہ لوگ قومِ سبا کی ایک شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۱۵ قبل مسیح میں اِن کو سبا کے ملک پر غلبہ حاصل ہوا اور ۳۰۰ء تک یہ حکمراں رہے۔ عرب میں صدیوں تک اِن کی عظمت کے افسانے زبان زدِ خلائق رہے ہیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حاشیہ ۳۷)

۳۳؎ یہ کفار کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ اِس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ انکارِ آخرت وہ چیز ہے جو کسی شخص، گروہ یا قوم کو مجرم بنائے بغیر نہیں رہتی۔ اخلاق کی خرابی اس کا لازمی نتیجہ ہے اور تاریخِ انسانی شاہد ہے کہ زندگی کے اِس نظریے کو جس قوم نے بھی اختیار کیا ہے وہ آخر کار تباہ ہو کر رہی ہے۔ رہا یہ سوال کہ "یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم اور اس سے پہلے کے لوگ"؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ تو اُس خوشحالی اور شوکت و حشمت کو پہنچ بھی نہیں سکے ہیں جو تُبّع کی قوم، اور اُس سے پہلے سبا اور قومِ فرعون اور دوسری قوموں کو حاصل رہی ہے۔ مگر یہ مادی خوشحالی اور دنیوی شان و شوکت اخلاقی زوال کے نتائج سے اُن کو کب بچا سکی تھی کہ یہ اپنی ذرا سی پونجی اور اپنے ذرائع و وسائل

ہم نے برحق پیدا کیا ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔[۳۴] ان سب کے اٹھائے جانے کے لیے طے شدہ وقت فیصلے کا دن ہے[۳۵]، وہ دن جب کوئی عزیز قریب اپنے کسی عزیز قریب[۳۶] کے کچھ بھی کام نہ آئے گا اور نہ کہیں سے انہیں کوئی مدد پہنچے گی سوائے اس کے کہ اللہ ہی

کے بل بوتے پر اُن سے بچ جائیں گے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ سبا، حواشی ۲۵-۳۶)۔

۳۴ یہ اُن کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی حیات بعد الموت اور آخرت کی جزا و سزا کا منکر ہے وہ دراصل اس کارخانۂ عالم کو کھلونا اور اس کے خالق کو نادان بچہ سمجھتا ہے، اسی بنا پر اُس نے یہ رائے قائم کی ہے کہ انسان دنیا میں ہر طرح کے ہنگامے برپا کر کے ایک روز بس یونہی مٹی میں رَل مِل جائے گا اور اس کے کسی اچھے یا بُرے کام کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا۔ حالانکہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کی نہیں بلکہ ایک خالق حکیم کی بنائی ہوئی ہے، اور کسی حکیم سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ فعلِ عبث کا ارتکاب کرے گا۔ انکارِ آخرت کے جواب میں یہ استدلال قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کیا گیا ہے، اور ہم اس کی مفصل تشریح کر چکے ہیں (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد اول، ص ۵۵۱۔ جلد دوم، ص ۲۶۴-۲۶۵۔ جلد سوم، ص ۱۵۱-۱۵۲-۳۰۲-۳۰۳-۳۰۱ تا ۳۵۷)۔

۳۵ یہ اُن کے اس مطالبے کا جواب ہے کہ "اٹھا لاؤ ہمارے باپ دادا کو اگر تم سچے ہو"۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی بعدِ موت کوئی تماشا تو نہیں ہے کہ جہاں کوئی اس سے انکار کرے، فوراً ایک مُردہ قبرستان سے اٹھا کر اس کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔ اس کے لیے تو رب العالمین نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے جب تمام اولین و آخرین کو وہ دوبارہ زندہ کر کے اپنی عدالت میں جمع کرے گا اور ان کے مقدمات کا فیصلہ صادر فرمائے گا۔ تم مانو چاہے نہ مانو، یہ کام بہر حال اپنے وقتِ مقرر پر ہی ہو گا۔ تم مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، کیونکہ اس طرح قبل از وقت خبردار ہو کر اُس عدالت سے کامیاب نکلنے کی تیاری کر سکو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا ہی نقصان کرو گے، کیونکہ اپنی ساری عمر اس غلط فہمی میں کھپا دو گے کہ بُرائی اور بھلائی جو کچھ بھی ہے بس اسی دنیا کی زندگی تک ہے، مرنے کے بعد

ع کسی پر رحم کرے، وہ زبردست اور رحیم ہے۔[۳۷]

زقوم[۳۸] کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا، تیل کی تلچھٹ[۳۹] جیسا، پیٹ میں اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔" پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ اور انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔ چکھ اس کا مزا، بڑا زبردست عزت دار آدمی ہے تو۔ یہ وہی چیز ہے جس کے آنے میں تم لوگ شک رکھتے تھے۔"

---

پھر کوئی عدالت نہیں ہوتی ہے جس میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا کوئی منتقل نتیجہ نکلتا ہو۔

۳۶۔ اصل میں لفظ "مولیٰ" استعمال کیا گیا ہے جو عربی زبان میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی تعلق کی بنا پر دوسرے شخص کی حمایت کرے، قطع نظر اس سے کہ وہ رشتہ داری کا تعلق ہو یا دوستی کا یا کسی اور قسم کا۔

۳۷۔ ان فقروں میں بتایا گیا ہے کہ فیصلے کے دن جو عدالت قائم ہوگی اُس کا کیا رنگ ہوگا کسی کی مدد یا حمایت، وہاں کسی مجرم کو نہ چھڑا سکے گی، نہ اُس کی سزا کم ہی کرا سکے گی۔ کلّی اختیارات اُس حاکم حقیقی کے ہاتھ میں ہوں گے جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی، اور جس کے فیصلے پر اثر انداز ہونے کا بل بوتا کسی میں نہیں ہے۔ یہ بالکل اُس کے اپنے اختیارِ تمیزی پر موقوف ہوگا کہ کسی پر رحم فرما کر اس کو سزا نہ دے یا کم سزا دے، اور حقیقت میں اُس کی شان یہی ہے کہ انصاف کرنے میں بے رحمی سے نہیں بلکہ رحم ہی سے کام لے۔ لیکن جس کے مقدمے میں جو فیصلہ بھی وہ کرے گا وہ بہر حال بے کم و کاست نافذ ہوگا۔ عدالتِ الٰہی کی یہ کیفیت بیان کرنے کے بعد آگے کے چند فقروں میں بتایا گیا ہے کہ اُس عدالت میں جو لوگ مجرم ثابت ہوں گے ان کا انجام کیا ہوگا، اور جن لوگوں کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ دنیا میں خدا سے ڈر کر نافرمانیوں سے پرہیز کرتے رہے تھے، ان کو کن انعامات سے سرفراز کیا جائے گا۔

۳۸۔ زقوم کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ صافات، حاشیہ ۳۴۔

۳۹۔ اصل میں لفظ "المُهل" استعمال ہوا ہے جس کے کئی معنی ہیں: پگھلی ہوئی دھات، پیپ لہو۔

خدا ترس لوگ امن کی جگہ میں[۴۰] ہونگے ۔ باغوں اور چشموں میں، حریر و دیبا[۴۱] کے لباس پہنے، آمنے سامنے بیٹھے ہونگے ۔ یہ ہوگی ان کی شان ۔ اور ہم گوری گوری آہو چشم عورتیں[۴۲] ان سے بیاہ دیں گے ۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر طرح کی لذیذ چیزیں طلب کریں[۴۳] گے ۔ وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے، بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی ۔ اور اللہ اپنے فضل سے ان کو جہنم

---

پگھلا ہوا تانبہ، کھولتا ہوا تیل کی تلچھٹ ۔ یہ مختلف معنی اہلِ لغت اور مفسرین نے بیان کیے ہیں ۔ لیکن اگر زقوم سے مراد وہی چیز ہے جسے ہمارے ہاں تھوہر کہتے ہیں، تو اس کو چبانے سے جو رس نکلے گا، اغلب یہی ہے کہ وہ تیل کی تلچھٹ سے مشابہ ہوگا ۔

۴۰ امن کی جگہ سے مراد ایسی جگہ ہے جہاں کسی قسم کا کھٹکا نہ ہو ۔ کوئی غم، کوئی پریشانی، کوئی خطرہ اور اندیشہ، کوئی مشقت اور تکلیف لاحق نہ ہو ۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اہلِ جنت سے کہہ دیا جائے گا کہ یہاں تم ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ زندہ رہو گے کبھی نہ مرو گے، ہمیشہ خوشحال رہو گے کبھی خستہ حال نہ ہو گے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہ ہو گے" (مسلم بروایت ابوہریرہ و ابو سعید خدری)

۴۱ اصل میں سُندس اور اِستبرق کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔ سُندس عربی زبان میں باریک ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں ۔ اور اِستبرق فارسی لفظ ستبر کا معرب ہے، اور یہ دبیز ریشمی کپڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔

۴۲ اصل الفاظ ہیں حُور عِین ۔ حُور جمع ہے حَوراء کی اور حَوراء عربی زبان میں گوری عورت کو کہتے ہیں ۔ اور عِین جمع ہے عَیناء کی، اور یہ لفظ بڑی بڑی آنکھوں والی عورت کے لیے بولا جاتا ہے

۴۳ "اطمینان سے" طلب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز جنتی چاہیں گے بے فکری کے ساتھ جنت کے خادموں کو اس کے لانے کا حکم دیں گے اور وہ حاضر کردی جائے گی ۔ دنیا میں کوئی شخص ہوٹل تو درکنار، خود اپنے گھر میں اپنی چیز بھی اُس اطمینان سے طلب نہیں کرسکتا جس طرح وہ جنت میں طلب کرے گا ۔ کیونکہ یہاں کسی چیز کے بھی اتھاہ ذخیرے کسی کے پاس نہیں ہوتے، اور جو چیز بھی آدمی استعمال

کے عذاب سے بچا دے گا، یہی بڑی کامیابی ہے۔[۴۴]

اے نبی، ہم نے اِس کتاب کو تمہاری زبان میں سہل بنا دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اب تم بھی انتظار کرو، یہ بھی منتظر ہیں۔[۴۵] ع ۳ ع

---

کرتا ہے اُس کی قیمت بہر حال اس کی اپنی جیب ہی سے جاتی ہے جنت میں مال اللہ کا ہو گا اور بندے کو اس کے استعمال کی کھلی اجازت ہو گی۔ نہ کسی چیز کے ذخیرے ختم ہو جانے کا خطرہ ہو گا نہ بعد میں بِل پیش ہونے کا کوئی سوال۔

[۴۴] اس آیت میں دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد جہنم سے بچائے جانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے، حالانکہ کسی شخص کا جنت میں پہنچ جانا آپ سے آپ اس امر کو مستلزم ہے کہ وہ جہنم میں جانے سے بچ گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرمانبرداری کے انعام کی قدر انسان کو پوری طرح اسی وقت محسوس ہو سکتی ہے جبکہ اس کے سامنے یہ بات بھی ہو کہ نافرمانی کرنے والے کہاں پہنچے ہیں، اور وہ کس بُرے انجام سے بچ گیا ہے۔ دوسری قابلِ توجہ بات اس میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جہنم سے بچنے اور جنت میں پہنچنے کو اپنے فضل کا نتیجہ قرار دے رہا ہے۔ اس سے انسان کو اس حقیقت پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ یہ کامیابی کسی شخص کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہو۔ اگرچہ آدمی کو انعام اس عمل ہی پر ملے گا، لیکن اوّل تو حسنِ عمل ہی کی توفیق آدمی کو اللہ کے فضل کے بغیر کیسے نصیب ہو سکتی ہے۔ پھر جو بہتر سے بہتر عمل بھی آدمی سے بن آسکتا ہے وہ کبھی کامل و اکمل نہیں ہو سکتا جس کے متعلق دعوے سے یہ کہا جا سکے کہ اس میں نقص کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ بندے کی کمزوریوں اور اس کے عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر کے اُس کی خدمات کو قبول فرما لے اور اسے انعام سے سرفراز فرمائے۔ ورنہ باریک بینی کے ساتھ حساب کرنے پر وہ اتر آئے تو کس کی یہ ہمت ہے کہ اپنی قوتِ بازو سے جنت جیت لینے کا دعویٰ کر سکے۔ یہی بات ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا اعملوا وسدّدوا وقاربوا واعلموا انّ احدًا لن یدخلہ عملہ الجنّۃ "عمل کرو اور اپنی حدِ استطاعت تک زیادہ سے زیادہ ٹھیک کام کرنے کی کوشش کرو، مگر یہ جان لو کہ کسی شخص کو

محض اس کا عمل ہی جنت میں نہ داخل کر دے گا"۔ لوگوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ، کیا آپ کا عمل بھی؟" فرمایا ولا انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ "ہاں میں بھی محض اپنے عمل کے زور سے جنت میں نہ پہنچ جاؤنگا الّا یہ کہ میرا رب مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے"۔

۴۵؎ یعنی اب اگر یہ لوگ نصیحت قبول نہیں کرتے تو دیکھتے رہو کہ ان کی کس طرح شامت آتی ہے۔ اور یہ لوگ بھی اس انتظار میں ہیں کہ دیکھیں تمہاری اس دعوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔

---

# تفہیم القرآن جلد اوّل میں ایک تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل جن حضرات کے پاس موجود ہے ان سے گزارش ہے کہ سورۂ نساء حاشیہ نمبر ۱۹۵ کی آخری سطریں "پس قرآن کی روح سے جو طرز عمل زیادہ مطابقت رکھتا ہے" سے آخر تک حذف کر کے ان کی جگہ حسب ذیل سطور درج کریں:

"پھر رفع جسمانی کے اس عقیدے کو مزید تقویت اُن احادیث سے پہنچتی ہے جو قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ ابن مریم کے دوبارہ دنیا میں آنے اور دجال سے جنگ کرنے کی تصریح کرتی ہیں (تفسیر سورۂ احزاب کے ضمیمہ میں ہم نے ان احادیث کو نقل کر دیا ہے)۔ اُن سے حضرت عیسیٰ کی آمدِ ثانی تو قطعی طور پر ثابت ہے۔ اب یہ ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ اُن کا مرنے کے بعد دوبارہ اس دنیا میں آنا زیادہ قرینِ قیاس ہے، یا زندہ کہیں خدا کی کائنات میں موجود ہونا اور پھر واپس آنا؟

---

## ایک اور تصحیح

ترجمان القرآن، جون ۶۵ء میں صفحہ ۲۴۰؍۲۴ پر ایک آیت غلط درج ہو گئی ہے۔ اِنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ کے بجائے صحیح الفاظ اِنَّ هٰؤُلَاۗءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ہیں۔

# خلافتِ راشدہ سے ملوکیت تک

(۲)

ابو الاعلیٰ مودودی

**پانچواں مرحلہ** حضرت عثمانؓ کی شہادت (۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ) کے بعد حضرت نعمان بن بشیر اُن کا خون سے بھرا ہوا قمیص، اور ان کی اہلیہ محترمہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں، حضرت معاویہؓ کے پاس دمشق لے گئے اور انہوں نے یہ چیزیں منظرِ عام پر لٹکا دیں تاکہ اہلِ شام کے جذبات بھڑک اُٹھیں[۳۲]۔ یہ اِس بات کی کھلی علامت تھی کہ حضرت معاویہؓ خونِ عثمان کا بدلہ قانون کے راستہ سے نہیں بلکہ غیر قانونی طریقہ سے لینا چاہتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ شہادتِ عثمانؓ کی خبر ہی لوگوں میں غم و غصہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی، اس قمیص اور ان انگلیوں کا مظاہرہ کر کے عوام میں اشتعال پیدا کرنے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

اِدھر حضرت علیؓ نے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد جو کام سب سے پہلے کیے ان میں سے ایک یہ تھا کہ محرم ۳۶ھ میں حضرت معاویہ کو شام سے معزول کر کے حضرت سہل بن حُنیف کو ان کی جگہ مقرر کر دیا۔ مگر ابھی یہ نئے گورنر تبوک تک ہی پہنچے تھے کہ شام کے سواروں کا ایک دستہ اُن سے آ کر ملا اور اس نے کہا "اگر آپ حضرت عثمانؓ کی طرف سے آئے ہیں تو اہلاً و سہلاً، اور اگر کسی اور کی طرف سے آئے ہیں تو واپس تشریف لے جائیے"[۳۳]۔ یہ اس بات کا صاف نوٹس تھا کہ شام کا صوبہ نئے خلیفہ کی اطاعت کے لیے تیار نہیں ہے۔ حضرت علیؓ نے ایک اور صاحب کو اپنے ایک خط کے ساتھ حضرت معاویہ کے پاس بھیجا، مگر انہوں نے اس کا

---

۳۲؎ ابن الاثیر ج ۳، ص ۹۸ - البدایہ، ج ۷، ص ۲۲۷

۳۳؎ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۰۳ - البدایہ، ج ۷، ص ۲۲۸

کوئی جواب نہ دیا اور صفر ۳۶ھ میں اپنی طرف سے ایک لفافہ اپنے ایک پیغامبر کے ہاتھ ان کے پاس بھیج دیا۔ حضرت علیؓ نے لفافہ کھولا تو اس میں کوئی خط نہ تھا۔ حضرت علیؓ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا "میرے پیچھے دمشق میں ۶۰ ہزار آدمی خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینے کے لیے بے تاب ہیں"۔ حضرت علیؓ نے پوچھا، کس سے بدلہ لینا چاہتے ہیں؟ اس نے کہا "آپ کی رگِ گردن سے"[۳۴]۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ شام کا گورنر صرف اطاعت ہی سے منحرف نہیں ہے بلکہ اپنے صوبہ کی پوری فوجی طاقت مرکزی حکومت سے لڑنے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے اور اس کے پیشِ نظر قاتلینِ عثمانؓ سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینا ہے۔

یہ سب کچھ اس چیز کا نتیجہ تھا کہ حضرت معاویہ مسلسل ۱۶-۱۷ سال ایک ہی صوبے، اور وہ بھی جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہم صوبے کی گورنری پر رکھے گئے۔ اسی وجہ سے شام خلافتِ اسلامیہ کے ایک صوبے کی بہ نسبت اُن کی ریاست زیادہ بن گیا تھا۔ مؤرخین نے حضرت علیؓ کے حضرت معاویہؓ کو معزول کرنے کا واقعہ کچھ ایسے انداز سے بیان کیا ہے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ تدبّر سے بالکل ہی کورے تھے۔ مُغیرہ بن شعبہ نے ان کو عقل کی بات بتائی تھی کہ معاویہ کو نہ چھیڑیں، مگر انہوں نے اپنی نادانی سے یہ رائے نہ مانی اور حضرت معاویہ کو خواہ مخواہ بھڑکا کر مصیبت مول لے لی۔ حالانکہ واقعات کا جو نقشہ خود اُنہی کی لکھی ہوئی تاریخوں سے ہمارے سامنے آتا ہے اسے دیکھ کر کوئی سیاسی بصیرت رکھنے والا آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت علیؓ اگر حضرت معاویہ کی معزولی کا حکم صادر کرنے میں تاخیر کرتے تو یہ بہت بڑی غلطی ہوتی۔ ان کے اس اقدام سے ابتدا ہی میں یہ بات کھل گئی کہ حضرت معاویہ کس مقام پر کھڑے ہیں۔ زیادہ دیر تک اُن کے موقف پر پردہ پڑا رہتا تو یہ دھوکے کا پردہ ہوتا جو زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ نے اس کے بعد شام پر چڑھائی کی تیاری شروع کر دی۔ اُس وقت اُن کے لیے شام کو اطاعت پر مجبور کر دینا کچھ بھی مشکل نہ تھا، کیونکہ جزیرۃ العرب، عراق اور مصر اُن کے تابع

۳۴ء الطبری، جلد ۳، ص ۴۶۴ - ابن الاثیر، ج ۳ ص ۱۰۴ - البدایہ، ج ۷، ص ۲۲۹

زمان تھے، تنہا شام کا صوبہ ان کے مقابلے پر زیادہ دیر نہ ٹھیر سکتا تھا۔ علاوہ بریں دنیائے اسلام کی عام رائے بھی اس کو ہرگز پسند نہ کرتی کہ ایک صوبے کا گورنر خلیفہ کے مقابلے میں تلوار لے کر کھڑا ہو جائے۔ بلکہ اس صورت میں خود شام کے لوگوں کے لیے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ وہ سب متحد ہو کر خلیفہ کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کا ساتھ دیتے۔ لیکن عین وقت پر ام المومنین حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر رضی اللہ عنہم کے اُس اقدام نے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، حالات کا نقشہ یکسر بدل دیا اور حضرت علیؓ کو شام کی طرف بڑھنے کے بجائے، ربیع الثانی ۳۶ھ میں بصرے کا رُخ کرنا پڑا۔[۳۵]

جنگِ جمل (جمادی الاُخریٰ ۳۶ھ) سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے پھر شام کے معاملے کی طرف توجہ کی اور حضرت جَریر بن عبداللہ البَجَلی کو حضرت معاویہ کے پاس ایک خط دے کر بھیجا جس میں اُن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اُمّت جس خلافت پر جمع ہو چکی ہے اس کی اطاعت قبول کر لیں اور جماعت سے الگ ہو کر تفرقہ نہ ڈالیں۔ مگر حضرت معاویہ نے ایک مدت تک حضرت جَریر کو ہاں یا ناں کا کوئی جواب نہ دیا اور انہیں برابر ٹالتے رہے۔ پھر حضرت عمرو بن العاص کے مشورے سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ حضرت علیؓ کو خونِ عثمان کا ذمہ دار قرار دے کر ان سے جنگ کی جائے۔ دونوں حضرات کو یقین تھا کہ جنگِ جمل کے بعد اب حضرت علی کی فوج پوری طرح متحد ہو کر اُن کے جھنڈے تلے نہ لڑ سکے گی اور نہ عراق اُس دلجمعی کے ساتھ اُن کی حمایت کر سکے گا جو اہلِ شام میں حضرت معاویہ کے لیے پائی جاتی تھی۔[۳۶] اس دوران میں جبکہ حضرت معاویہؓ ٹال مٹول کر رہے تھے، حضرت جَریر بن عبداللہ نے دمشق میں شام کے بااثر لوگوں سے ملاقاتیں کر کے ان کو یقین دلایا کہ خونِ عثمان کی ذمہ داری سے حضرت علیؓ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت معاویہ کو اس سے تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے ایک صاحب کو اس کام پر مامور کیا کہ کچھ گواہ ایسے

---

۳۵ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۱۳۔

۳۶ الطبری، ج ۳، ص ۵۶۱۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۴۱-۱۴۲۔ البدایہ، ج ۷، ص ۲۵۳

تیار کریں جو اہلِ شام کے سامنے یہ شہادت دے دیں کہ حضرت علیؓ ہی حضرت عثمانؓ کے قتل کے ذمہ دار ہیں۔ چنانچہ وہ صاحب پانچ گواہ تیار کر کے لے آئے اور انہوں نے لوگوں کے سامنے یہ شہادت دی کہ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو قتل کیا ہے۔[۳۶]

اس کے بعد حضرت علیؓ عراق سے اور حضرت معاویہ شام سے جنگ کی تیاریاں کر کے ایک دوسرے کی طرف بڑھے اور صِفّین کے مقام پر جو فرات کے مغربی جانب الرّقہ کے قریب واقع تھا، فریقین کا آمنا سامنا ہوا۔ حضرت معاویہ کا لشکر فرات کے پانی پر پہلے قابض ہو چکا تھا۔ انہوں نے لشکرِ مخالف کو اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ پھر حضرت علیؓ کی فوج نے لڑ کر ان کو وہاں سے بے دخل کر دیا اور حضرت علیؓ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اپنی ضرورت بھر پانی لیتے رہو اور باقی سے لشکرِ مخالف کو فائدہ اٹھانے دو۔[۳۸]

ذی الحجہ کے آغاز میں باقاعدہ جنگ شروع ہونے سے پہلے حضرت علیؓ نے حضرت معاویہ کے پاس اتمامِ حجت کے لیے ایک وفد بھیجا۔ مگر ان کا جواب یہ تھا کہ "میرے پاس سے چلے جاؤ۔ میرے اور تمہارے درمیان تلوار کے سوا کچھ نہیں ہے۔"[۳۹]

کچھ مدت تک جنگ جاری رہنے کے بعد جب محرم ۳۷ھ کے آخر تک کے لیے التوائے جنگ کا معاہدہ ہو گیا تو حضرت علیؓ نے پھر ایک وفد حضرت عدی بن حاتم کی سرکردگی میں بھیجا جس نے حضرت معاویہؓ سے کہا کہ سب لوگ حضرت علیؓ پر جمع ہو چکے ہیں اور صرف آپ اور آپ کے ساتھی ہی ان سے الگ ہیں۔ حضرت معاویہ نے جواب دیا "وہ قاتلینِ عثمان کو ہمارے حوالہ کریں تاکہ ہم انہیں قتل کر دیں، پھر ہم تمہاری بات مان لیں گے اور اطاعت قبول کر کے جماعت کے ساتھ ہو جائیں گے"۔ اس کے بعد حضرت معاویہ نے ایک وفد حضرت علی کے پاس بھیجا جس کے سردار حبیب بن مَسْلمۃ الفِہری تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے کہا: "اگر آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ

[۳۷] الاستیعاب، ج ۲، ص ۵۸۶ [۳۸] الطبری، ج ۳، ص ۵۶۸-۵۶۹۔ ابن الاثیر، جلد ۳، ص ۱۴۵-۱۴۶۔ [۳۹] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۴۶

آپ نے حضرت عثمانؓ کو قتل نہیں کیا ہے تو جنہوں نے قتل کیا ہے انہیں ہمارے حوالہ کر دیں۔ ہم حضرت عثمان کے بدلے انہیں قتل کر دیں گے۔ پھر آپ خلافت سے دست بردار ہو جائیں، تاکہ مسلمان آپس کے مشورے سے جس پر اتفاق کریں اسے خلیفہ بنا لیں۔[۱۳۵]

محرم گزرنے کے بعد صفر ۳۷ھ سے اصل فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی اور آغاز ہی میں حضرت علیؓ نے اپنی فوج میں یہ اعلان کر دیا کہ "خبردار، لڑائی کی ابتدا اپنی طرف سے نہ کرنا جب تک وہ حملہ نہ کریں۔ پھر جب تم انہیں شکست دے دو تو کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرنا، کسی زخمی پر ہاتھ نہ ڈالنا، کسی کو برہنہ نہ کرنا، کسی مقتول کی لاش کا مُثلہ نہ کرنا۔ اور جب مخالفین کے کیمپ میں داخل ہو تو کسی عورت کو بے پردہ نہ کرنا، کسی گھر میں نہ گھُسنا، اُن کے مال نہ لوٹنا، اور عورتیں خواہ تمہیں گالیاں ہی کیوں نہ دیں، ان پر دست درازی نہ کرنا۔"[۱۳۶]

اِس جنگ کے دوران میں ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس نے نصِّ صریح سے یہ بات کھول دی کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عمّار بن یاسرؓ جو حضرت علیؓ کی فوج میں شامل تھے، حضرت معاویہ کی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ حضرت عمّار کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد صحابہ میں مشہور و معروف تھا، اور بہت سے صحابیوں نے اس کو حضورؐ کی زبان مبارک سے سُنا تھا کہ تقتلک الفئۃُ الباغیۃ "تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا"۔ مُسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نَسائی، طبرانی، بیہقی، مسند ابوداؤد طیالسی وغیرہ کتبِ حدیث میں حضرات ابوسعید خُدری، ابوقتادہ انصاری، ام سَلَمہ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمروؓ بن عاص، ابوہریرہ، عثمان بن عفان، حُذَیفہ، ابوایوب انصاری، ابورافعؓ، خُزیمہ بن ثابت، عمرو بن العاص، ابوالیُسر، عمّار بن یاسر رضی اللہ عنہم اور متعدد دوسرے صحابہ سے اس مضمون کی روایات منقول ہوئی ہیں۔ ابن سعد نے طبقات میں بھی یہ حدیث کئی سندوں

---

[۱۳۵] الطَّبری، جلد ۴، ص ۳-۴- ابن الاثیر، جلد ۳، ص ۱۴۷، ۱۴۸-۱۴۷- البدایہ، ج ۷، ص ۲۵۷-۲۵۸

[۱۳۶] الطَّبری ج ۴، ص ۶- ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۴۹-

سے نقل کی ہے۔[۴۲] متعدد صحابہ و تابعین نے، جو حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کی جنگ میں متذبذب تھے، حضرت عمارؓ کی شہادت کو یہ معلوم کرنے کے لیے ایک علامت قرار دے لیا تھا کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور باطل پر کون۔[۴۳] علامہ ابن عبد البر الاستیعاب میں لکھتے ہیں کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تواترِ آثار یہ بات منقول ہے کہ عمار بن یاسر کو باغی گروہ قتل کریگا اور یہ صحیح ترین احادیث میں سے ہے"۔[۴۴] یہی بات حافظ ابن حجر نے الاصابہ میں لکھی ہے۔[۴۵] دوسری جگہ حافظ ابن حجر کہتے ہیں: "قتلِ عمار کے بعد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حق حضرت علی کے ساتھ تھا اور اہل السنّت اس بات پر متفق ہو گئے، درانحالیکہ پہلے اس میں اختلاف تھا"۔[۴۶] حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں حضرت عمار بن یاسر کے قتل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی اس خبر کا راز کھل گیا کہ حضرت عمار کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا، اور اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ حضرت علیؓ حق پر ہیں اور حضرت معاویہ باغی ہیں"۔[۴۷] جنگِ جمل سے حضرت زبیرؓ کے ہٹ جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد یاد تھا اور انہوں نے دیکھا کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں حضرت عمار بن یاسر موجود ہیں۔[۴۸] مگر جب حضرت عمار کے شہید ہونے کی خبر حضرت معاویہ کے لشکر میں پہنچی اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے اپنے والد اور حضرت معاویہ دونوں کو حضورؐ کا

---

[۴۲] ابن سعد، ج ۳، ص ۲۵۱ تا ۲۵۳ - ۲۵۹

[۴۳] ایضاً، ج ۳، ص ۲۵۳ - ۲۵۹ - ۲۶۱ - الطبری، ج ۴، ص ۲۷ - ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۵۷ - ۱۶۵

[۴۴] الاستیعاب، ج ۲، ص ۴۲۴

[۴۵] الاصابہ، ج ۲، ص ۵۰۶ (مطبعۂ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۳۹)

[۴۶] الاصابہ، ج ۲، ص ۵۰۲

[۴۷] البدایہ، جلد ۷، ص ۲۷۰

[۴۸] البدایہ، جلد ۷، ص ۲۴۱

یہ ارشاد یاد دلایا تو حضرت معاویہ نے فوراً اس کی یہ تاویل کی کہ "کیا ہم نے عمار کو قتل کیا ہے؟ ان کو تو اس نے قتل کیا جو انہیں میدانِ جنگ میں لایا۔"[۷۹] حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ حضرت عمار کو باغی گروہ میدانِ جنگ میں لائے گا، بلکہ یہ فرمایا تھا کہ باغی گروہ ان کو قتل کرے گا، اور ظاہر ہے کہ ان کو قتل حضرت معاویہ کے گروہ نے کیا تھا نہ کہ حضرت علیؓ کے گروہ نے۔

حضرت عمار کی شہادت کے دوسرے روز (۱۰ صفر) سخت معرکہ برپا ہوا جس میں حضرت معاویہ کی فوج شکست کے قریب پہنچ گئی۔ اُس وقت حضرت عمرو بن العاص نے حضرت معاویہ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے اور کہے کہ ھٰذا حَکَمٌ بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم ہے)۔ اس کی مصلحت حضرت عمرو نے خود یہ بتائی کہ "اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے، اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے۔ ہم مجتمع رہیں گے اور اُن کے ہاں تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں مہلت مل جائے گی۔"[۸۰] اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی، قرآن کو حَکَم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا۔

اس مشورے کے مطابق لشکر معاویہ میں قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا، اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمرو بن العاص کو امید تھی۔ حضرت علیؓ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ اور جنگ کو آخری فیصلے تک پہنچ جانے دو۔ مگر ان میں پھوٹ پڑ کر رہی اور آخر کار حضرت علی مجبور ہو گئے کہ جنگ بند کر کے حضرت معاویہ سے تحکیم کا معاہدہ کریں۔ پھر یہی پھوٹ حُکَم مقرر کرنے کے موقع پر بھی رنگ دی۔ حضرت معاویہ نے اپنی طرف سے حضرت

---

[۷۹] الطبری، ج ۴، ص ۲۹۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۵۸۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۶۸-۲۶۹-۲۷۰
علامہ ابن کثیر حضرت معاویہ کی اس تاویل کے متعلق کہتے ہیں کہ "یہ بڑی دُور کی تاویل ہے جو انہوں نے پیش کی"۔

[۸۰] الطبری، جلد ۴، ص ۳۴۔ ابن سعد، ج ۴، ص ۲۵۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۶۰۔ البدایہ، ج ۷، ص ۲۷۲

عمرو بن العاص کو حکم بنایا۔ حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ اپنی طرف سے حضرت عبداللہ بن عباس کو مقرر کریں۔ مگر عراق کے لوگوں نے کہا وہ تو آپ کے چچا زاد بھائی ہیں، ہم غیر جانبدار آدمی چاہتے ہیں۔ آخر اُن کے اصرار پر حضرت ابو موسیٰ اشعری کو حکم بنانا پڑا، حالانکہ حضرت علی ان پر مطمئن نہ تھے[۵۱]

چھٹا مرحلہ | اب خلافت کو ملوکیت کی طرف جانے سے بچانے کا آخری موقع باقی رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ دونوں حکم ٹھیک اُس معاہدے کے مطابق اپنا فیصلہ دیں جس کی رُو سے ان کو فیصلے کا اختیار سونپا گیا تھا۔ معاہدے کی جو عبارت مؤرخین نے نقل کی ہے اس میں تحکیم کی بنیاد یہ تھی:

"دونوں حکم جو کچھ کتاب اللہ میں پائیں اس پر عمل کریں، اور جو کچھ کتاب اللہ میں نہ پائیں اس کے بارے میں سنتِ عادلہ جامعہ غیر مُفرِّقہ پر عمل کریں[۵۲]"

لیکن دُومۃ الجندل میں جب دونوں حکم مل کر بیٹھے تو سرے سے یہ امر زیر بحث ہی نہ آیا کہ قرآن و سنّت کی رُو سے اِس قضیہ کا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے۔ قرآن میں صاف حکم موجود تھا کہ مسلمانوں کے دو گروہ اگر آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کی صحیح صورت طائفۂ باغیہ کو راہِ راست پر آنے کے لیے مجبور کرنا ہے[۵۳] حضرت عمارؓ کی شہادت کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصِ صریح نے متعیّن کر دیا تھا کہ اس قضیے میں طائفۂ باغیہ کونسا ہے۔ ایک امیر کی امارت قائم ہو جانے کے بعد اس کی اطاعت نہ کرنے والے کے بارے میں بھی واضح احادیث موجود تھیں۔ خون کے دعوے کا بھی شریعت میں صاف ضابطہ موجود تھا جس کی رُو سے دیکھا جا سکتا تھا کہ حضرت معاویہؓ نے خونِ عثمانؓ کے متعلق اپنا دعویٰ ٹھیک طریقہ سے اٹھایا ہے یا غلط طریقہ سے۔ اور معاہدۂ تحکیم کی رُو سے دونوں صاحبوں کے سپرد یہ کام سرے سے کیا ہی نہیں گیا تھا کہ

[۵۱] الطبری، ج ۴، ص ۳۴-۳۵-۳۶۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۶۱-۱۶۲۔ البدایہ، ج ۷، ص ۲۷۵-۲۷۶

[۵۲] الطبری، ج ۴، ص ۳۸۔ البدایہ، ج ۷، ص ۲۷۶

[۵۳] الحجرات، آیت ۹۔

وہ خلافت کے مسئلے کا جو فیصلہ بطور خود مناسب سمجھیں کر دیں، بلکہ ان کے حوالے فریقین کا پورا جھگڑا اس صراحت کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اُن کے درمیان اوّلاً کتاب اللہ اور پھر سنّتِ عادلہ کے مطابق تصفیہ کریں۔ مگر جب دونوں بزرگوں نے بات چیت شروع کی تو ان سارے پہلوؤں کو نظر انداز کر کے یہ بحث شروع کر دی کہ خلافت کا مسئلہ اب کیسے طے کیا جائے۔

حضرت عمرو بن العاص نے حضرت ابو موسیٰ اشعری سے پوچھا، آپ کے نزدیک اس معاملہ میں کیا صورت مناسب ہوگی؟ انہوں نے کہا "میری رائے یہ ہے کہ ہم ان دونوں حضرات (علی و معاویہ) کو الگ کر کے خلافت کے مسئلے کو مسلمانوں کے باہمی مشورے پر چھوڑ دیں تاکہ وہ جسے چاہیں منتخب کر لیں"۔ حضرت عمرو نے کہا "ٹھیک بات یہی ہے جو آپ نے سوچی ہے"۔ اس کے بعد دونوں صاحب مجمعِ عام میں آئے جہاں دونوں طرف کے چار چار سو اصحاب اور کچھ غیر جانبدار بزرگ موجود تھے۔ حضرت عمرو نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا آپ ان لوگوں کو بتا دیجیے کہ ہم ایک رائے پر متفق ہو گئے"۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت ابو موسیٰ سے کہا "اگر آپ دونوں ایک رائے پر متفق ہو گئے ہیں تو اُس متفقہ فیصلہ کا اعلان عمرو بن العاص کو کرنے دیجیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ دھوکا کھا گئے ہیں"۔ حضرت ابو موسیٰ نے کہا "مجھے اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے، ہم نے بالاتفاق ایک فیصلہ کیا ہے"۔ پھر وہ تقریر کے لیے اٹھے اور اس میں اعلان کیا کہ "میں اور میرے یہ دوست (یعنی عمرو بن العاص) ایک بات پر متفق ہو گئے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ ہم علی اور معاویہ کو الگ کر دیں اور لوگ باہمی مشورے سے جس کو پسند کریں اپنا امیر بنا لیں۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ کو معزول کرتا ہوں۔ اب آپ لوگ اپنا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لیں اور جسے اہل سمجھیں اپنا امیر بنا لیں"۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا "ان صاحب نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے اپنے آدمی (حضرت علی) کو معزول کر دیا ہے۔ میں بھی ان کی طرح انہیں معزول کرتا ہوں اور اپنے آدمی (حضرت معاویہ) کو قائم رکھتا ہوں کیونکہ وہ عثمان ابن عفان کے ولی اور

اُن کے خون کے دعوے دار اور ان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں"۔ حضرت ابو موسیٰ نے یہ بات سنتے ہی کہا مَالَكَ لا وفقك الله، غدرتَ و فجرتَ (یہ تم نے کیا کیا؟ خدا تمہیں توفیق نہ دے، تم نے دھوکا دیا اور عہد کی خلاف ورزی کی)۔ حضرت سعد بن ابی وقاص بولے "افسوس تمہارے حال پر اے ابو موسیٰ، تم عمرو کی چالوں کے مقابلے میں بڑے کمزور نکلے"۔ حضرت ابو موسیٰ نے جواب دیا "اب میں کیا کروں؟ اس شخص نے مجھ سے ایک بات پر اتفاق کیا اور پھر اُس سے دامن چھڑا لیا"۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کہا "ابو موسیٰ اس سے پہلے مر گئے ہوتے تو ان کے حق میں زیادہ اچھا تھا"۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے کہا: "دیکھو، اس امت کا حال کہاں جا پہنچا ہے۔ اس کا مستقبل دو ایسے آدمیوں کے حوالے کر دیا گیا جن میں سے ایک کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے، اور دوسرا ضعیف ہے[۵۴]"۔ درحقیقت کسی شخص کو بھی وہاں اس امر میں شک نہ تھا کہ دونوں کے درمیان اُسی بات پر اتفاق ہوا تھا جو حضرت ابو موسیٰ نے اپنی تقریر میں کہی تھی اور حضرت عمرو بن العاص نے جو کچھ کیا وہ طے شدہ بات کے بالکل خلاف تھا۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے جا کر حضرت معاویہ کو خلافت کی بشارت دی، اور حضرت ابو موسیٰ شرم کے مارے حضرت علی کو منہ نہ دکھا سکے اور سیدھے مکے چلے گئے[۵۵]۔

حافظ ابن کثیر حضرت عمرو بن العاص کے اِس فعل کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ "انہوں نے اس حالت میں لوگوں کو بلا امام چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، کیونکہ اُس وقت لوگوں میں جو اختلاف برپا تھا اس کو دیکھتے ہوئے انہیں خطرہ تھا کہ ایسا کرنا ایک طویل و عریض فساد کا موجب ہو گا اس لیے انہوں نے مصلحت کی بنا پر حضرت معاویہ کو برقرار رکھا، اور اجتہاد صحیح بھی ہوتا ہے

---

[۵۴] الطبری، ج ۴، ص ۵۱۔ ابن سعد، ج ۴، ص ۲۵۶-۲۵۷۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۶۸۔ البدایہ والنہایہ، ج ۷، ص ۲۸۲-۲۸۳

[۵۵] البدایہ، ج ۷، ص ۲۸۳

اور غلط بھی ۵۶؎۔ لیکن جو انصاف پسند آدمی بھی نیزوں پر قرآن اٹھانے کی تجویز سے لیکر اس وقت تک کی رُوداد پڑھے گا وہ مشکل ہی سے یہ مان سکتا ہے کہ یہ سب کچھ "اجتہاد" تھا۔

بلا شبہ ہمارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ واجب الاحترام ہیں، اور بڑا ظلم کرتا ہے وہ شخص جو اُن کی کسی غلطی کی وجہ سے اُن کی ساری خدمات پر پانی پھیر دیتا ہے اور ان کے مرتبے کو بھول کر گالیاں دینے پر اُتر آتا ہے۔ مگر یہ بھی کچھ کم زیادتی نہیں ہے کہ اگر ان میں سے کسی نے کوئی غلط کام کیا ہو تو ہم محض صحابیت کی رعایت سے اس کو "اجتہاد" قرار دینے کی کوشش کریں۔ بڑے لوگوں کے غلط کام اگر ان کی بڑائی کے سبب سے اجتہاد بن جائیں تو بعد کے لوگوں کو ہم کیا کہہ کر ایسے "اجتہادات" سے روک سکتے ہیں۔ اجتہاد کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ امرِ حق معلوم کرنے کے لیے آدمی اپنی انتہائی حدِ وسع تک کوشش کرے۔ اس کوشش میں دانستہ غلطی بھی ہو جائے تو حق معلوم کرنے کی کوشش بجائے خود اجر کی مستحق ہے لیکن جان بوجھ کر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق غلط کام کرنے کا نام اجتہاد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت اس طرح کے معاملات میں افراط و تفریط، دونوں ہی یکساں احتراز کے لائق ہیں۔ کوئی غلط کام محض شرفِ صحابیت کی وجہ سے مشرّف نہیں ہو جاتا بلکہ صحابی کے مرتبۂ بلند کی وجہ سے وہ غلطی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے لیکن اُس پر رائے زنی کرنے والے کو لازماً یہ احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ غلط کو صرف غلط سمجھنے اور کہنے پر اکتفا کرے۔ اس سے آگے بڑھ کر صحابی کی ذات کو بحیثیت مجموعی مطعون نہ کرنے لگے۔

اِس بحث سے قطع نظر کہ دونوں حَکَموں میں سے ایک نے کیا کیا اور دوسرے نے کیا، بجائے خود یہ پوری کارروائی جو دُومۃ الجندل میں ہوئی، معاہدۂ تحکیم کے بالکل خلاف اور اس کے حدود سے قطعی متجاوز تھی۔ اِن حضرات نے غلط طور پر یہ فرض کر لیا کہ وہ حضرت علیؓ کو معزول کرنے کے مجاز ہیں، حالانکہ وہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد باقاعدہ آئینی طریقے پر خلیفہ منتخب ہوئے تھے، اور معاہدۂ تحکیم کے کسی لفظ سے یہ اختیار اِن دونوں حضرات کو نہیں سونپا گیا تھا کہ وہ

۵۶؎ حوالہ مذکور

اُنہیں معزول کر دیں۔ پھر انہوں نے یہ بھی غلط فرض کر لیا کہ حضرت معاویہ ان کے مقابلے میں خلافت کا دعویٰ لے کر اٹھے ہیں، حالانکہ اُس وقت تک وہ صرف خونِ عثمان کے مدعی تھے نہ کہ منصبِ خلافت کے۔ مزید برآں ان کا یہ مفروضہ بھی غلط تھا کہ وہ خلافت کے مسئلے کا فیصلہ کرنے کے لیے حَکَم بنائے گئے ہیں۔ معاہدۂ تحکیم میں اس مفروضے کے لیے کوئی بنیاد موجود نہ تھی۔ اسی بنا پر حضرت علیؓ نے ان کے فیصلے کو رد کر دیا اور اپنی جماعت میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"سنو، یہ دونوں صاحب جنہیں تم لوگوں نے حَکَم مقرر کیا تھا، انہوں نے قرآن کے حکم کو پیٹھ پیچھے ڈال دیا، اور خدا کی ہدایت کے بغیر ان میں سے ہر ایک نے اپنے خیالات کی پیروی کی، اور ایسا فیصلہ دیا جو کسی واضح حجت اور سنّتِ ماضیہ پر مبنی نہیں ہے، اور اس فیصلے میں دونوں نے اختلاف کیا ہے، اور دونوں ہی کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہنچے ہیں[۵۷]"۔

اس کے بعد حضرت علیؓ نے کوفہ واپس پہنچ کر شام پر چڑھائی کی پھر تیاریاں شروع کر دیں۔ اس زمانے میں انہوں نے جو تقریریں کیں اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امت پر ملوکیت کے مسلط ہو جانے کا خطرہ کس شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے اور خلافتِ راشدہ کے نظام کو بچانے کے لیے کس طرح ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ایک تقریر میں وہ فرماتے ہیں:

"خدا کی قسم، اگر یہ لوگ تمہارے حاکم بن گئے تو تمہارے درمیان کسریٰ اور ہرقل کی طرح کام کریں گے[۵۸]"۔

ایک دوسری تقریر میں انہوں نے فرمایا:

"چلو اُن لوگوں کے مقابلے میں جو تم سے اس لیے لڑ رہے ہیں کہ ملوکِ جبابرہ بن جائیں اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنالیں[۵۹]"۔

---

۵۷۔ الطبری، ج ۴، ص ۵۷۔ ۵۸۔ الطبری، ج ۴ ص ۵۸۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۷۱۔

۵۹۔ الطبری، ج ۴، ص ۵۹۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۱۷۲

مگر عراق کے لوگ ہمت ہار چکے تھے اور خوارج کے فتنے نے حضرت علیؓ کے لیے مزید ایک دردِ سر پیدا کر دیا تھا۔ پھر حضرت معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص کی تدبیروں سے مصر اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے، اور دنیائے اسلام عملاً دو متحارب حکومتوں میں بٹ گئی۔ آخر کار حضرت علیؓ کی شہادت (رمضان سنہ ۴۰ھ) اور پھر حضرت حسن کی مصالحت (سنہ ۴۱ھ) نے میدان حضرت معاویہ کے لیے پوری طرح خالی کر دیا۔ اس کے بعد جو حالات پیش آئے انہیں دیکھ کر بہت سے وہ لوگ بھی، جو پہلے حضرت علیؓ اور ان کے مخالفین کی لڑائیوں کو محض فتنہ سمجھ کر غیر جانبدار رہے تھے، یہ اچھی طرح جان گئے کہ حضرت علیؓ کس چیز کو قائم رکھنے اور اُمت کو کس انجام سے بچانے کے لیے اپنی جان کھپا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عُمرؓ نے اپنے آخری زمانے میں کہا "مجھے کسی چیز پر اتنا افسوس نہیں ہے جتنا اس بات پر ہے کہ میں نے علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ کیوں نہ دیا"۔ ابراہیم النخعی کی روایت ہے کہ مسروق بن اَجدع حضرت علیؓ کا ساتھ نہ دینے پر توبہ و استغفار کیا کرتے تھے[۶۱]۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کو عمر بھر اس بات پر سخت ندامت رہی کہ وہ حضرت علیؓ کے خلاف جنگ میں حضرت معاویہ کے ساتھ کیوں شریک ہوتے تھے[۶۲]۔

حضرت علیؓ نے اس پورے فتنے کے زمانے میں جس طرح کام کیا وہ ٹھیک ٹھیک ایک خلیفۂ راشد کے شایانِ شان تھا۔ البتہ صرف ایک چیز ایسی ہے جس کی مدافعت مشکل ہی سے کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ جنگِ جمل کے بعد انہوں نے قاتلینِ عثمان کے بارے میں اپنا رویّہ بدل دیا۔ جنگِ جمل تک وہ ان لوگوں سے بیزار تھے، با دلِ ناخواستہ اُن کو برداشت کر رہے تھے اور ان پر گرفت کرنے کے لیے موقع کے منتظر تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ سے گفتگو

---

[۶۰] ابن سعد، ج ۴، ص ۱۸۷۔ ابن عبدالبرّ، الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۰-۳۷

[۶۱] الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۰۔

[۶۲] ایضاً۔ ج ۱، ص ۳۷۱

کرنے کے لیے جب انہوں نے حضرت قعقاع بن عمرو کو بھیجا تھا تو ان کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت قعقاع نے کہا تھا کہ "حضرت علیؓ نے قاتلینِ عثمان پر ہاتھ ڈالنے کو اُس وقت تک مؤخر کر رکھا ہے جب تک وہ انہیں پکڑنے پر قادر نہ ہو جائیں، آپ لوگ بیعت کر لیں تو پھر خونِ عثمانؓ کا بدلہ لینا آسان ہو جائے گا"[۶۳] پھر جنگ سے عین پہلے جو گفتگو اُن کے اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ کے درمیان ہوئی اس میں حضرت طلحہؓ نے اُن پر الزام لگایا کہ آپ خونِ عثمانؓ کے ذمہ دار ہیں، اور انہوں نے جواب میں فرمایا لعن اللہ قتلۃ عثمان (عثمان کے قاتلوں پر خدا کی لعنت)[۶۴]۔ لیکن اس کے بعد بتدریج وہ لوگ اُن کے ہاں تقرّب حاصل کرتے گئے جو حضرت عثمانؓ کے خلاف شورش برپا کرنے اور بالآخر انہیں شہید کرنے کے ذمہ دار تھے حتیٰ کہ انہوں نے مالک بن حارث الاشتر اور محمد بن ابی بکر کو گورنری کے عہدے تک دے دیے، درآنحالیکہ قتلِ عثمان میں ان دونوں صاحبوں کا جو حصّہ تھا وہ سب کو معلوم ہے ممکن ہے کہ اس کے کچھ ایسے اسباب ہوں جو آج ہمارے علم میں نہ ہوں، مگر دل یہی کہتا ہے کہ کاش امیرالمومنین نے اس سے احتراز فرمایا ہوتا۔

بعض لوگ اس بات پر بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے اپنے متعدد رشتہ داروں کو بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا، مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبیداللہ بن عباسؓ حضرت قُثَم بن عباس وغیرہم لیکن یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ انہوں نے یہ کام ایسے حالات میں کیا تھا جبکہ اعلیٰ درجہ کی صلاحیتیں رکھنے والے اصحاب میں سے ایک گروہ ان کے ساتھ تعاون نہیں کر رہا تھا، دوسرا گروہ مخالف کیمپ میں شامل ہو گیا تھا، اور تیسرے گروہ میں سے آئے دن لوگ نکل نکل کر دوسری طرف جا رہے تھے۔ ان حالات میں وہ انہی لوگوں سے کام لینے پر مجبور تھے جن پر وہ پوری طرح اعتماد کر سکیں۔ یہ صورتِ حال حضرت عثمانؓ کے دور کی صورتِ

[۶۳] البدایہ، ج ۷، ص ۲۳۷

[۶۴] ایضاً، ج ۷، ص ۲۴۰

حال سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی کیونکہ اُن کو اپنے وقت میں امت کے تمام ذی صلاحیت لوگوں کا مکمل تعاون حاصل تھا۔

**آخری مرحلہ** حضرت معاویہ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی ریاست کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا۔ بصیرت رکھنے والے لوگ اسی مرحلے میں یہ سمجھ گئے تھے کہ اب ہمیں بادشاہی سے سابقہ درپیش ہے۔ چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص جب حضرت معاویہ کی بیعت ہو جانے کے بعد ان سے ملے تو السلام علیک ایھا الملک کہہ کر خطاب کیا۔ حضرت معاویہ نے کہا اگر آپ امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا؟ انہوں نے جواب دیا "خدا کی قسم جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی ہے اُس طریقہ سے اگر یہ مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا"[65]۔ حضرت معاویہ خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے خود کہا تھا کہ انا اول الملوک "میں مسلمانوں میں پہلا بادشاہ ہوں"[66]۔ بلکہ حافظ ابن کثیر کے بقول سنّت بھی یہی ہے کہ ان کو خلیفہ کے بجائے بادشاہ کہا جائے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے پیشگوئی فرمائی تھی کہ "میرے بعد خلافت ۳۰ سال رہے گی، پھر بادشاہی ہوگی"، اور یہ مدت ربیع الاول سنہ ۴۱ھ میں ختم ہو گئی جبکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوئے[67]۔

اب خلافت علی منہاج النبوۃ کے بحال ہونے کی آخری صورت صرف یہ باقی رہ گئی تھی کہ حضرت معاویہ یا تو اپنے بعد اس منصب پر کسی شخص کے تقرر کا معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے

---

[65] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۰۵۔ حضرت سعدؓ کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں جو کچھ تھا اس پر بہترین روشنی اس واقعہ سے پڑتی ہے کہ زمانۂ فتنہ میں ایک دفعہ ان کے بھتیجے ہاشم بن عتبہ بن ابی وقاص نے ان سے کہا کہ اگر آپ اس وقت خلافت کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ایک لاکھ تلواریں آپ کی حمایت کے لیے تیار ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ "ان ایک لاکھ تلواروں میں سے میں صرف ایک تلوار ایسی چاہتا ہوں جو کافر پر تو چلے مگر کسی مسلمان پر نہ چلے" (البدایہ، ج ۸، ص ۷۲)۔ [66] الاستیعاب، ج ۱، ص ۲۵۴۔ البدایہ والنہایہ، ج ۸، ص ۱۳۵۔

[67] البدایہ، ج ۸، ص ۱۶

پر چھوڑ دیتے، یا اگر قطعِ نزاع کے لیے اپنی زندگی ہی میں جانشینی کا معاملہ طے کر جانا ضروری سمجھتے تو مسلمانوں کے اہلِ علم و اہلِ خیر کو جمع کر کے انہیں آزادی کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے دیتے کہ ولی عہدی کے لیے اُمت میں موزوں تر آدمی کون ہے۔ لیکن اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کے لیے خوف و طمع کے ذرائع سے بیعت لے کر انہوں نے اس امکان کا بھی خاتمہ کر دیا۔

اس تجویز کی ابتدا حضرت مُغیرہ بن شعبہ کی طرف سے ہوئی۔ حضرت معاویہ انہیں کوفے کی گورنری سے معزول کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انہیں اس کی خبر مل گئی۔ فوراً کوفہ سے دمشق پہنچے اور یزید سے مل کر کہا کہ "صحابہ کے اکابر اور قریش کے بڑے لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لیے بیعت لے لینے میں تامل کیوں کر رہے ہیں"۔ یزید نے اس بات کا ذکر اپنے والد ماجد سے کیا۔ اُنہوں نے حضرت مغیرہ کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا بات ہے جو تم نے یزید سے کہی۔ حضرت مغیرہ نے جواب دیا "امیر المومنین، آپ دیکھ چکے ہیں کہ قتلِ عثمان کے بعد کیسے کیسے اختلافات اور خون خرابے ہوئے۔ اب بہتر یہ ہے کہ آپ یزید کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد مقرر کر کے بیعت لے لیں تاکہ اگر آپ کو کچھ ہو جائے تو اختلاف برپا نہ ہو"۔ حضرت معاویہ نے پوچھا "اس کام کو پورا کرا دینے کی ذمہ داری کون لے گا"؟ انہوں نے کہا "اہلِ کوفہ کو میں سنبھال لوں گا اور اہلِ بصرہ کو زیاد۔ اس کے بعد پھر اور کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے"۔ یہ بات کر کے حضرت مغیرہ کوفہ آئے اور دس آدمیوں کو تیس ہزار درہم دے کر اس بات پر راضی کیا کہ ایک وفد کی صورت میں حضرت معاویہ کے پاس جائیں اور یزید کی ولی عہدی کے لیے ان سے کہیں۔ یہ وفد حضرت مغیرہ کے بیٹے موسیٰ بن مُغیرہ کی سرکردگی میں دمشق گیا اور اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ بعد میں حضرت معاویہ نے موسیٰ کو الگ بلا کر پوچھا "تمہارے باپ نے ان لوگوں سے کتنے میں ان کا دین خریدا ہے"؟ انہوں نے کہا "۳۰ ہزار درہم میں"۔ حضرت معاویہ نے کہا "تب تو ان کا دین ان کی نگاہ میں بہت ہلکا ہے"۔[۵۶]

---

[۵۶] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۴۹۔ البدایہ، ج ۸، ص ۷۹۔

پھر حضرت معاویہ نے بصرے کے گورنر زیاد کو لکھا کہ اس معاملہ میں تمہاری کیا رائے ہے۔ اُس نے عُبَید بن کعب النُّمَیری کو بلا کر کہا امیرالمومنین نے مجھے اِس معاملہ میں لکھا ہے اور میرے نزدیک یزید میں یہ یہ کمزوریاں ہیں، لہٰذا تم ان کے پاس جاکر کہو کہ آپ اس معاملہ میں جلدی نہ کریں۔ عُبَید نے کہا آپ حضرت معاویہ کی رائے خراب کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔ میں جاکر یزید سے کہتا ہوں کہ امیرالمومنین نے اس معاملہ میں امیر زیاد کا مشورہ طلب کیا ہے، اور ان کا خیال یہ ہے کہ لوگ اِس تجویز کی مخالفت کریں گے، کیونکہ تمہارے بعض طور طریقے لوگوں کو ناپسند ہیں۔ اس لیے امیر زیاد تم کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم اِن چیزوں کی اصلاح کر لو تاکہ یہ معاملہ ٹھیک بن جائے۔ زیاد نے اس رائے کو پسند کیا اور عُبَید نے دمشق جاکر ایک طرف یزید کو اصلاحِ اطوار کا مشورہ دیا اور دوسری طرف حضرت معاویہ سے کہا کہ آپ اس معاملے میں جلدی نہ کریں۔[۶۹] مورخین کا بیان ہے کہ اس کے بعد یزید نے اپنے بہت سے اُن اعمال کی اصلاح کر لی جو قابلِ اعتراض تھے۔ مگر اس رُوداد سے دو باتیں بالکل واضح ہیں۔ ایک یہ کہ یزید کی ولی عہدی کے لیے ابتدائی تحریک کسی صحیح جذبے کی بنیاد پر نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایک بزرگ نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے دوسرے بزرگ کے ذاتی مفاد سے اپیل کر کے اس تجویز کو جنم دیا، اور دونوں صاحبوں نے اس بات سے قطع نظر کر لیا کہ وہ اِس طرح امّتِ محمدیہ کو کس راہ پر ڈال رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یزید بجائے خود اس مرتبے کا آدمی نہ تھا کہ حضرت معاویہ کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرتے ہوئے کوئی شخص یہ رائے قائم کرتا کہ حضرت معاویہ کے بعد امّت کی سربراہی کے لیے وہ موزوں ترین آدمی ہے۔

زیاد کی وفات (سنہ ۵۳ھ) کے بعد حضرت معاویہ نے یزید کو ولی عہد بنانے کا فیصلہ کر لیا اور بااثر لوگوں کی رائے ہموار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر کو ایک لاکھ درہم بھیجے اور یزید کی بیعت کے لیے راضی کرنا چاہا۔ انہوں نے کہا "اچھا یہ روپیہ اِس مقصد کے لیے بھیجا گیا ہے۔ پھر تو میرا دین میرے لیے بڑا ہی سستا ہو گیا"۔ یہ کہہ کر انہوں نے روپیہ

۶۹ الطبری، ج ۴، ص ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ البدایہ، ج ۸، ص ۷۹

لینے سے انکار کر دیا۔[۵۰]

پھر حضرت معاویہ نے مدینے کے گورنر مروان بن الحکم کو لکھا کہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں، چاہتا ہوں کہ اپنی زندگی ہی میں کسی کو جانشین مقرر کر دوں۔ لوگوں سے پوچھو کہ جانشین مقرر کرنے کے معاملہ میں وہ کیا کہتے ہیں۔ مروان نے اہلِ مدینہ کے سامنے یہ بات پیش کی۔ لوگوں نے کہا ایسا کرنا عین مناسب ہے۔ اس کے بعد حضرت معاویہ نے مروان کو پھر لکھا کہ میں نے جانشینی کے لیے یزید کو منتخب کیا ہے۔ مروان نے پھر یہ معاملہ اہلِ مدینہ کے سامنے رکھ دیا اور مسجدِ نبوی میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "امیر المومنین نے تمہارے لیے مناسب آدمی تلاش کرنے میں کوئی کسر نہیں رکھی ہے اور اپنے بعد اپنے بیٹے یزید کو جانشین بنایا ہے۔ یہ بہت اچھی رائے ہے جو اللہ نے ان کو سجھائی۔ اگر وہ اس کو جانشین مقرر کر رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ابوبکر و عمر نے بھی جانشین مقرر کیے تھے"۔ اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر اٹھے اور انہوں نے کہا "جھوٹ بولے ہو تم اے مروان، اور جھوٹ کہا معاویہ نے۔ تم نے ہرگز امتِ محمدیہ کی بھلائی نہیں سوچی ہے بلکہ اسے قیصریت بنانا چاہتے ہو کہ جب ایک قیصر مرا تو اس کی جگہ اس کا بیٹا آگیا۔ یہ سنتِ ابوبکر و عمر نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی اولاد میں سے کسی کو جانشین نہیں بنایا تھا"۔ مروان نے کہا "پکڑو اس شخص کو، یہی ہے وہ جس کے متعلق قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ أُفٍّ لَّكُمَا ..... (الاحقاف، ۱۷)"۔ حضرت عبدالرحمٰن نے بھاگ کر حضرت عائشہ کے حجرے میں پناہ لی۔ حضرت عائشہ چیخ اٹھیں کہ "جھوٹ کہا مروان نے۔ ہمارے خاندان کے کسی فرد کے معاملہ میں یہ آیت نہیں آئی ہے، بلکہ ایک اور شخص کے معاملہ میں آئی ہے، جس کا نام میں چاہوں تو بتا سکتی ہوں۔ البتہ مروان کے باپ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی تھی جبکہ مروان ابھی اس کی صلب میں تھا"۔ اس مجلس میں حضرت عبدالرحمٰن کی طرح حضرت حسین بن علی، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے بھی یزید کی ولی عہدی ماننے سے انکار کر دیا۔[۵۱]

[۵۰] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۵۰۔ البدایہ، ج ۸، ص ۸۹

[۵۱] اگلے صفحہ پر

اسی زمانہ میں حضرت معاویہ نے مختلف علاقوں سے وفود بھی طلب کیے اور یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا۔ جواب میں لوگ خوشامدانہ تقریریں کرتے رہے، مگر حضرت اَحنَف بن قیس خاموش رہے۔ حضرت معاویہ نے کہا "ابو بحر، تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے کہا "ہم سچ کہیں تو آپ کا ڈر ہے، جھوٹ بولیں تو خدا کا ڈر۔ امیر المومنین، آپ یزید کے شب و روز، خلوت و جلوت، آمد و رفت، ہر چیز کو خوب جانتے ہیں۔ اگر آپ اُس کو اللہ اور اِس امت کے لیے واقعی پسندیدہ جانتے ہیں تو اس کے بارے میں کسی سے مشورہ نہ لیجیے۔ اور اگر آپ کے علم میں وہ اس سے مختلف ہے تو آخرت کو جاتے ہوئے دنیا اس کے حوالے کر کے نہ جائیے۔ رہے ہم، تو ہمارا کام تو بس یہ ہے کہ جو حکم ملے اس پر سمعنا و اطعنا کہہ دیں"[1]۔

عراق، شام اور دوسرے علاقوں سے بیعت لینے کے بعد حضرت معاویہ خود حجاز تشریف لے گئے، کیونکہ وہاں کا معاملہ سب سے اہم تھا اور دنیائے اسلام کی وہ با اثر شخصیتیں جن سے مزاحمت کا اندیشہ تھا وہیں رہتی تھیں۔ مدینے کے باہر حضرت حسینؓ، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابن عمر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر ان سے ملے۔ حضرت معاویہ نے ان سے ایسا درشت برتاؤ کیا کہ وہ شہر چھوڑ کر مکے چلے گئے۔ اس طرح مدینے کا معاملہ آسان ہو گیا۔ پھر انہوں نے مکے کا رُخ کیا اور ان چاروں اصحاب کو خود شہر کے باہر بلا کر ان سے ملے۔ اِس مرتبہ اُن کا برتاؤ

---

[1] اس واقعہ کا مختصر ذکر بخاری، تفسیر سورۂ احقاف میں ہے، اور علامہ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کی تفصیلات نسائی، اسماعیلی، ابن المنذر، ابو یعلیٰ اور ابن ابی حاتم سے نقل کی ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو الاستیعاب ج ۲، ص ۳۹۳۔ البدایہ ج ۸، ص ۸۹۔ ابن الاثیر ج ۳، ص ۲۵۰۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ "بعض روایات کی رُو سے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کا انتقال ۵۳ھ میں ہو چکا تھا اس لیے اگر یہ صحیح ہے تو وہ اس موقع پر موجود نہیں ہو سکتے تھے"۔ لیکن حدیث کی معتبر روایتیں اِس کے خلاف ہیں، اور البدایہ میں حافظ ابن کثیر بتاتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن کا انتقال ۵۸ھ میں ہوا ہے۔

[2] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۵۰ - ۲۵۱ - البدایہ، ج ۸، ص ۸۰

اُس کے برعکس تھا جو مدینے کے باہر اُن سے کیا تھا۔ ان پر بڑی مہربانیاں کیں۔ انہیں اپنے ساتھ لیے ہوئے شہر میں داخل ہوئے۔ پھر تخلیے میں بلا کر انہیں یزید کی بیعت پر راضی کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب میں کہا "آپ تین کاموں میں سے ایک کام کیجیے۔ یا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح کسی کو جانشین نہ بنائیے، لوگ خود اُسی طرح کسی کو اپنا خلیفہ بنا لیں گے جس طرح انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو بنایا تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجیے جو حضرت ابوبکرؓ نے کیا کہ اپنی جانشینی کے لیے حضرت عمرؓ جیسے شخص کو مقرر کیا جن سے ان کا کوئی دُور پرے کا رشتہ بھی نہ تھا۔ یا پھر وہ طریقہ اختیار کیجیے جو حضرت عمرؓ نے کیا کہ چھ آدمیوں کی شوریٰ تجویز کی اور اس میں ان کی اولاد میں سے کوئی شامل نہ تھا"۔ حضرت معاویہ نے باقی حضرات سے پوچھا "آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟" انہوں نے کہا ہم بھی وہی کہتے ہیں جو ابنِ زبیرؓ نے کہا ہے۔ اس پر حضرت معاویہ نے کہا "اب تک میں تم لوگوں سے درگزر کرتا رہا ہوں۔ اب میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تم میں سے کسی نے میری بات کے جواب میں ایک لفظ بھی کہا تو دوسری بات اس کی زبان سے نکلنے کی نوبت نہ آئے گی، تلوار اس کے سر پر پہلے پڑ چکی ہوگی"۔ پھر اپنے باڈی گارڈ کے افسر کو بلا کر حکم دیا کہ "ان میں سے ہر ایک پر ایک ایک آدمی مقرر کر دو اور اسے تاکید کر دو کہ ان میں سے جو بھی میری بات کی تردید یا تائید میں زبان کھولے، اس کا سر قلم کر دے"۔ اس کے بعد وہ انہیں لیے ہوئے مسجد میں آئے اور اعلان کیا کہ "یہ مسلمانوں کے سردار اور بہترین لوگ، جن کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کیا جاتا، یزید کی ولی عہدی پر راضی ہیں اور انہوں نے بیعت کر لی ہے۔ لہٰذا تم لوگ بھی بیعت کر لو"۔ اب لوگوں کی طرف سے انکار کا کوئی سوال ہی باقی نہ تھا۔ اہلِ مکہ نے بھی بیعت کر لی[۵۴]۔

اس طرح خلافتِ راشدہ کے نظام کا آخری اور قطعی طور پر خاتمہ ہو گیا۔ خلافت کی جگہ شاہی خانوادوں (DYNASTIES) نے لے لی۔ اور مسلمانوں کو اُس کے بعد سے

---

[۵۴] ابن الاثیر، ج ۳، ص ۲۵۲

آج تک پھر اپنی مرضی کی خلافت نصیب نہ ہو سکی۔ حضرت معاویہؓ کے محامد و مناقب اپنی جگہ پر ہیں۔ ان کا شرفِ صحابیت بھی واجب الاحترام ہے۔ ان کی یہ خدمت بھی ناقابلِ انکار ہے کہ انہوں نے پھر سے دنیائے اسلام کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا اور دنیا میں اسلام کے غلبے کا دائرہ پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا۔ ان پر جو شخص لعن طعن کرتا ہے وہ بلاشبہ زیادتی کرتا ہے۔ لیکن ان کے غلط کام کو تو غلط کہنا ہی ہو گا۔ اُسے صحیح کہنے کے معنی یہ ہونگے کہ ہم اپنے صحیح و غلط کے معیار کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔

---

# مؤتمر اسلامی میں شاہ فیصل کی تقریر

ترجمہ: عمر فاروق مودودی

(گذشتہ حج کے موقع پر رابطۂ عالمِ اسلامی کے تحت مکہ معظمہ میں جو مؤتمر عالم اسلامی منعقد ہوئی تھی اس کا افتتاح کرتے ہوئے شاہ فیصل نے حسبِ ذیل تقریر کی تھی:

اس مؤتمر کا افتتاح اللہ بزرگ و برتر کے نام کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے اور کامیابی سے ہمکنار کرے۔

برادرانِ اسلام! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپ اپنی اس مؤتمر کا انعقاد حرم محترم میں اللہ کے گھر کے جوار میں اور اس پاک شہر کی تقدس مآب فضاؤں میں کر رہے ہیں جہاں سے اسلام کا نور پھوٹا اور جہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ برادرانِ گرامی آپ جس مؤتمر کا انعقاد کر رہے ہیں وہ عام روایتی قسم کی مُؤتمر نہیں ہے، بلکہ آپ کو اس مُؤتمر میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے مسائل پر غور کرنا ہے۔ تمام دنیا کے مسلمانوں کی نظریں اس وقت آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ یہ امید رکھتے ہیں کہ یہ مؤتمر ایک عہد جدید کا آغاز ثابت ہوگی ـــــ ایسا عہدِ جدید جس میں مسلمان راہِ حق میں قدم بڑھائیں گے اسلام کے لیے کام کرنے والوں کی ٹھیک ٹھیک رہنمائی کریں گے، اور کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی طرف دعوت دیں گے۔

برادرانِ کرام! آج مسلمان جس امتحان سے دوچار ہیں، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ماضی میں مسلمانوں کا سابقہ کھلے کھلے دشمنوں سے تھا جو باہر سے حملہ آور ہوتے تھے اور مسلمان ان کے مقابلے میں برسرپیکار ہونے تھے۔ مگر آج ہم کچھ ایسے مصائب میں گرفتار ہیں جو ہمارے اپنے ہی ہاتھوں کی پیدا وار ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ حضرات کو اسلام اور مسلمانوں کی موجودہ صورتِ حال کا پورا اندازہ

ہو گا۔ اس لیے میں اس ذکر کو طول نہیں دینا چاہتا۔ جو کچھ میں جانتا ہوں، آپ بھی جانتے ہیں، بلکہ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

برادرانِ گرامی! اس موتمر میں آپ ہر خطۂ ارض کے مسلمانوں کی امیدوں کا مرکز ہیں۔ اس لیے ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ سال کے سال حج بیت اللہ کی صورت میں اس خداداد موقعے سے فائدہ اٹھائیں، اپنے عوارض کا علاج کریں، اپنے مسائل کا حل سوچیں، اپنے معاملات کی اصلاح کریں، امورِ دین میں غور کریں اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امت کی خدمت کا جو فرض ہم پر عائد ہوتا ہے، اسے بجا لائیں۔

برادرانِ کرام! ہم بحیثیتِ قوم اور بحیثیتِ حکومت، اس ملک میں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے حضور میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اور آپ کو اپنے ان بندوں میں شامل کرے جن کے بارے میں اس نے فرمایا ہے "الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر"۔ اللہ مملکت عربیہ سعودیہ کے باشندوں اور اس کی حکومت کو آپ سب کے درمیان دعوتِ حق کا سب سے زیادہ سرگرم کارکن ہونے کا شرف عطا فرمائے اور توفیق بخشے کہ ہم امتِ اسلامیہ کی زیادہ سے زیادہ خدمت اور اس کا بول بالا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔ اللہ ہماری امیدیں بر لائے اور ہمارے لیے راہِ حق کو روشن کر دے۔

برادرانِ کرام! آج ہم اس امت میں تفرقے، خانہ جنگیاں اور اختلافات دیکھ رہے ہیں۔ یہ اختلافات اور آپس کے جھگڑے ایک خطرۂ عظیم کا پیش خیمہ ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جب ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت موجود ہے تو پھر یہ تفرقے اور اختلافات کیوں؟ کتاب اللہ اور سنتِ رسول کی موجودگی میں تو ہم سب کو اپنے تمام معاملات میں کتاب و سنت ہی کا فیصلہ حاصل کرنا چاہیے۔ دینِ اسلام، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ترقی، قوت، عدالت اور مساوات کا علمبردار ہے۔ کسی نظام اور کسی انسانی قانون کے لیے یہ ممکن نہیں ہے

کہ وہ ویسا نظم وضبط پیدا کر سکے جیسا نظم وضبط اسلام پیدا کرتا ہے۔ نہ کوئی نظام اور انسانی قانون ازل سے لے کر ابد تک کے انسانی تقاضوں کو اس حد تک پورا کر سکتا ہے جس حد تک اسلام پورا کرتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم مسلمان ہوتے ہوئے، اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے اور اسوۂ رسول کی پیروی کرتے ہوئے، انسان کے بنائے ہوئے قوانین اور دساتیر میں پناہ ڈھونڈتے ہیں؟ وہ قوانین اور دساتیر جو ہمارے اصولِ دین سے ٹکراتے ہیں؟

حضرات! بلا شبہ اسلام مسلمانوں کی تنظیم کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا، مگر یہ تنظیم کتاب و سنّت سے مستنبط ہونی چاہیے۔ اس لیے ہمیں اپنے معاملات کی تنظیم اس انداز سے کرنی چاہیے جس سے ان کی اصلاح ہو سکے اور ایسا کرتے ہوئے ہمیں کتاب و سُنّت کی پیروی کرنی چاہیے۔ البتہ بسا اوقات یہ مشکل پیش آتی ہے کہ ہم کتاب اللہ اور سنّتِ رسول کو سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہماری نظر کتاب و سُنّت کی تعلیمات کی گہرائیوں تک نہیں پہنچتی۔ ایسے وقت میں ہمیں تلاش و جستجو سے کام لینا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کے فاضل علماء مسلمانوں کی تفہیم کا فریضہ ادا کریں گے۔ اور شریعت کے غوامض اس طرح کھول کر بیان کر دیں گے کہ مسلمانوں کا ہر فرد ان تک رسائی پا سکے۔

حضرات! آج اسلام اور مسلمانوں کو جن نت نئی تحریکات، تباہ کُن نظریات اور دین محمدی علی صاحبہا افضل التحیات سے متصادم مذاہب کا مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے، میں ان کے ذکر کو طول نہیں دینا چاہتا۔ البتہ اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس مصیبت کو جس چیز نے دوچند کر دیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی اپنی ہی صفوں وہ لوگ موجود ہیں جو ان تباہ کن اور اسلام سے متصادم نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ان کی تبلیغ کر رہے ہیں اور مسلم اقوام کے سروں پر انہیں مسلط کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

حضرات! مجھے علم ہے کہ ہمیں اپنی اس دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں ایسے لوگوں سے بھی سابقہ پڑے گا جو آ کر ہم سے اُلجھیں گے، ہم پر تنقیدیں کریں گے اور ہو سکتا ہے کہ کبھی ہمارے

خلاف مخالفت کا طوفان بھی اٹھائیں۔ لیکن بحول اللہ وقوتہ ہم ہرگز ان مزاحمتوں کے سامنے سرِتسلیم خم نہیں کریں گے۔ ہم اللہ کے دین کی خدمت کے لیے اپنی جانیں وقف کر چکے ہیں اور بقدر امکان و استطاعت اس کی رضا کی خاطر جدوجہد کرنے کا عزم کر چکے ہیں۔ اب جو الجھنا چاہے وہ اُلجھے اور جو حملہ آور ہونا چاہے وہ حملہ آور ہو۔ ہم نہ جھکیں گے، نہ گالی کا جواب گالی سے دیں گے، بلکہ اللہ سے ان کے لیے ہدایت کی دعا کریں گے اور اس قولِ ماثور پر اکتفا کریں گے:

"اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون"

حضرات! مملکتِ عربیہ سعودیہ بحیثیتِ قوم و حکومت کرۂ ارض پر بسنے والے اپنے تمام مسلمان بھائیوں کی تائید و حمایت کرتی ہے اور ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے بھی یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے معین و مددگار ہوں گے اور ہر اس کام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے جس میں ان کے لیے دین اور دنیا کی بھلائی ہو۔

مسلمان اس وقت دو گروہوں میں منقسم ہیں: ایک گروہ ان مسلمانوں کا ہے جو اپنے اپنے ملکوں میں خود مختار ہیں۔ ان پر فرض ہے کہ وہ اپنے معاملات کتاب و سنّت کے مطابق چلائیں اور مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی جو ذمّہ داری ان پر عائد ہوتی ہے اُسے ادا کریں، خواہ وہ مسائل ان کے اپنے ملک کے ہوں یا دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اب رہا دوسرا گروہ تو وہ ان اقلیّات پر مشتمل ہے جو ایسے ممالک میں آباد ہیں جن کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ انہیں شرعی احکام کی پیروی کرنی چاہیے اور اپنے دین کی جو خدمت بھی ان پر واجب ہے اسے بجا لانا چاہیے۔ ہم اپنے ان بھائیوں سے یہ نہیں کہتے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کے خلاف بغاوت کر دیں یا کسی قسم کی بدنظمی پیدا کریں۔ لیکن جہاں تک ان کی اپنی ذوات و نیات و عقائد کا تعلق ہے، انہیں کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرنا چاہیے۔ اور جو ان کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ کرے، انہیں بھی اس کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ انہیں دہشت انگیز اور تخریب پسند عنصر نہیں بننا چاہیے۔

حضرات! آج کے دن جس کے لیے ہم بارگاہِ خداوندی سے امید وار ہیں کہ احیاءِ اسلامی کا نقطۂ آغاز ثابت ہو، مَیں چاہتا ہوں کہ مملکتِ عربیہ سعودیہ کی سیاسی پالیسی اپنے بھائیوں کی خدمت میں پیش کردوں اور اس کی وضاحت کر دوں۔

ہماری سیاسی پالیسی اپنی سابقہ ڈگر سے سرِ مُو منحرف نہیں ہوئی ہے۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہیں خواہ وہ کسی خطہ یا کسی مقام میں آباد ہوں۔ ہم اپنی تمام تر قوت کے ساتھ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد پیدا کرنے اور ان کو زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ بھی ہے کہ ان تمام مؤثرات اور عوامل کا ازالہ کیا جائے جو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو خراب کر رہے ہیں۔ ہم مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کی تحریک کی تائید کرتے ہیں تاکہ عالمِ اسلام کی یہ مقتدر اعلیٰ ہیئت مسلمانوں کے معاملات اور مسائل میں غور و فکر کرے اور مل جُل کر ان کی اصلاح کرے۔

جہاں تک سیاستِ عرب کا تعلق ہے، ہماری پالیسی عرب لیگ کے دائرے میں رہتے ہوئے اخوت، محبت اور تعاون کی پالیسی ہے۔ ہم اپنے عرب بھائیوں کے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔ اللہ کی نصرت اور حمایت شاملِ حال رہی تو ہم ہر آڑے وقت میں صفِ اوّل میں ہوں گے۔ اپنے عرب بھائیوں سے ہم جو کچھ بھی امید رکھتے ہیں وہ صرف اتنی ہے کہ وہ ہمیں چشمِ اخوت و محبت سے دیکھیں اور ہمارے لیے تکالیف اور مشکلات کا سرچشمہ نہ بن جائیں۔

بین الاقوامی سیاست میں ہم اقوامِ متحدہ کے رکن ہیں اور اس کے میثاق کا احترام کرتے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل کونسل میں جو مسائل بھی زیرِ بحث آتے ہیں، ہم ان میں حق اور انصاف کا ساتھ دیتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے اختلافات اور نزاعات میں ہمارا موقف غیر جانبداری کا موقف ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کی حمایت کرتے ہیں۔ جن مسائل کا تعلق بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور عالمی امن سے ہوتا ہے، ہم ان میں خاص طور پر دلچسپی لیتے ہیں۔

داخلی امور میں ہمارا اوّلین مطمحِ نظر اللہ کی کتاب اور اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت کا نفاذ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے معاملات اور مسائل کا حل کتاب و سنت سے اس طور پر استنباط کر کے نکالیں کہ وہ استنباط کتاب و سنت کے دائرے سے باہر نہ چلا جائے۔

حضرات! ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ملک اور اپنی قوم کو بھرپور ترقی، خوش حالی اور اصلاحات سے ہمکنار کریں۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں اور اللہ پر بھروسہ رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں کہ راہ کی تمام تر سختیوں اور مشکلات کے باوجود آگے بڑھتے رہیں گے۔ حکومت نے جو اصلاحات کی ہیں اور ملک کو جس خوشحالی سے ہمکنار کیا ہے، مَیں آپ کے سامنے اس کی تفصیل بیان نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ آپ خود اسے دیکھ سکتے ہیں۔

برادرانِ کرام! اس جگہ میں کوئی سیاسی مسئلہ چھیڑنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک مسئلہ ایسا ہے جس سے تغافل یا تجاہل برتنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اور یہ مسئلہ آپ کا اپنا مسئلہ ہے مَیں اس مسئلے سے کسی علاقائی یا سیاسی بنیاد پر بحث نہیں کرنا بلکہ میں اس مسئلے کو ایک اسلامی مسئلے کی حیثیت سے پیش کرتا ہوں جو سینۂ گیتی پر بسنے والے ہر مسلمان کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ فلسطین کا مسئلہ ہے جسے غصب کر لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ نہ سیاسی ہے نہ اقتصادی بلکہ یہ ایک انسانی اور اسلامی مسئلہ ہے۔ ایک قوم پر اس کے اپنے وطن میں حملہ کیا گیا، اسے اس کے گھروں سے نکال باہر کیا گیا، آج وہ دنیا بھر میں بکھری ہوئی دربدر بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے کیا گیا کہ کچھ لوگ دنیا بھر میں پراگندہ و منتشر تھے، ان کے ایک گروہ نے چاہا کہ ان کا بھی کوئی ٹھکانا ہو، چنانچہ ان کی نگاہ انتخاب فلسطین پر پڑی۔ اس انتخاب میں دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں نے ان کی پیٹھ ٹھونکی۔ اس طرح بدقسمتی سے یہ انتخاب ایک مصیبت بن کر آپ کے عرب بھائیوں کے سروں پر نازل ہوا۔ وہ اپنے ملک سے نکالے گئے اور کاسۂ گدائی لیے ہوئے مختلف

ممالک میں پناہ گزیں ہو گئے اور اب ان کی تمام تر کوششیں کسی نہ کسی طرح سر رشتۂ حیات برقرار رکھنے پر مرکوز ہیں۔

فلسطین اپنی سرزمین میں تیسرے حرم کا امین ہے اور اس کے دامن میں مسلمانوں اور عربوں کی ہزار ہا برس کی تاریخ ثبت ہے۔ ہم قومی اور نسلی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں لیکن ہم یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ ہم کسی قوم یا گروہ کی خاطر بھینٹ چڑھ جائیں۔

یہ ہے آپ کا مسئلۂ فلسطین۔ یہ مسئلہ اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اسے آپ کے ضمیر کے حوالے کرتے ہیں تاکہ آپ اس مسئلے میں جو دنیا بھر میں ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اپنی نظیر نہیں رکھتا مسلمانوں اور عربوں کی توقعات پوری کر سکیں۔

حضرات! میں طولِ کلام کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مگر یہ موقع اور یہ وقت ایسا ہے کہ ہمیں اپنے تمام اہم مسائل کا پوری شرح و بسط کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے۔ تاکہ ہمیں اپنی پوزیشن کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور ہم اپنے مستقبل کے لیے تیار ہو سکیں۔ اور اپنا فرض ادا کر سکیں، سب سے پہلے وہ فرض جو من جانب اللہ ہم پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ جو ہمارے ضمیر کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا ہے، اور پھر وہ جو ملک اور قوم کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔

برادرانِ کرام! آپ کو اللہ کی راہ میں علمِ جہاد بلند کرنے کی دعوت دی جاتی ہے لیکن یہ بات خیال میں رکھیے کہ فقط بندوق اٹھانے یا تلوار کھینچنے کا نام جہاد نہیں ہے۔ بلکہ فی الحقیقت جہاد فی سبیل اللہ، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے نظام بننے اور اس پر جم جانے کا نام ہے خواہ اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے اور خواہ اس راہ میں کیسی ہی مشکلات اور مصائب سے کیوں نہ دوچار ہونا پڑے۔

حضرات! مسلمانوں کا ہر ہر فرد اپنے اپنے دائرے میں اللہ کی رضا کی خاطر کام کرنے کا مکلف ہے۔ اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ تا بہ حد امکان کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف دعوت دے اور اس کی راہ میں جدوجہد کرے۔ چنانچہ ہم آپ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ آپ اپنی اس مؤتمر میں مسلمانوں کے تمام امور پر خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی توجہ دیں گے اور ان گوشوں پر بھی اپنی توجہ مبذول کریں گے جہاں معترضین اسلام اور اسلامی شریعت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

یہ تو تھا ان مسائل کا تذکرہ جن کا تعلق ہمارے دین اور عقیدے سے ہے۔ اب کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو اجتماعی، اقتصادی اور تنظیمی اہمیت کے مالک ہیں۔ آپ کو مل جل کر ان مسائل کا مطالعہ کرنا ہے اور کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ (صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ) کے مطابق ان کا حل پیش کرنا ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم دنیا پر یہ ثابت کر سکیں کہ ہمارا دین ہی دینِ حق ہے، باطل کسی جانب سے بھی اس پر غالب نہیں آ سکتا۔ اور اس لیے بھی کہ ہم اس دعوے کی تردید کر سکیں کہ اسلام اجتماعی، اقتصادی اور تعلیمی تنظیم کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

برادرانِ کرام! میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ سے امیدوار ہوں کہ وہ ہمیں اپنے فرائض کی بجا آوری کی توفیق عطا فرمائے۔ ہماری نیتوں اور عقائد کی اصلاح فرمائے، ہمیں اس راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے جو اس نے ہمارے لیے مقرر کر دیا ہے۔ اور ہمارے مستقبل کو ماضی سے زیادہ تابناک بنائے۔ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡر۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔

# رسائل و مسائل

## بشریتِ خضر کا مسئلہ

سوال۔ تفہیم القرآن جلد سوم زیرِ مطالعہ ہے۔ حضرتِ خضر کا واقعہ اور آپ کا فٹ نوٹ نمبر۶ پوری طرح پڑھ چکا ہوں۔ حضرتِ خضر کی نسبت آپ کا قیاس اور میلان یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کوئی فرشتہ یا غیر بشر ہوں گے۔ میرے ذہن میں چند ایسے امور موجود ہیں جو آپ کے میلان سے سردست متفق ہونے پر راضی نہیں ہونے دیتے۔ اس لیے آپ کی مزید واضح تفہیم کا محتاج ہوں۔ آپ کے استدلال کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ ہر مومن کی بشریت مکلفِ شریعت ہے۔ اس لیے حضرت خضر کی بشریت تسلیم کرنے میں "شرعی ٹکراؤ" یا شرعی پیچیدگی حائل و مانع ہے۔ گویا اگر اس کا کوئی حل نکل آئے تو حضرت خضر کی بشریت معرضِ بحث میں نہیں آتی لیکن حضرت خضر کا قرآن میں جس طرح پر ذکر آیا ہے اس سے ان کے بشر ہونے ہی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو کام انسان کے کرنے کے ہیں ان کو فرشتے انجام نہیں دیا کرتے۔ رضائے الٰہی کسی انسان کے نفع و ضرر کے پیشِ نظر، کسی فرشتہ یا کارکنانِ قضا و قدر کو، کسی خاص مشن پر اسی وقت مامور فرماتی ہے جب انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور اس کی ساری توانائی اور اس کے تمام ذرائع و وسائل جواب دے جاتے ہیں پھر ان کی کارکردگی کے طور طریقے بھی انسانی طور طریقوں سے بالکل مختلف اور ممتاز قسم کی ندرت بھی رکھتے ہیں۔

کشتی کا تختہ توڑنے، لڑکے کو ہلاک کرنے اور گرتی دیوار کو سنبھالا دینے کے

لیے کسی فرشتے کی توانائی درکار نہیں ہوتی۔ یہ معمولی انسانی کام ہیں اور ان میں وہ امتیازی ندرت بھی نہیں پائی جاتی جو غیبی کارکردگی کی طرف ذہن کو منتقل کر سکے۔ اس لیے قرینہ یہی کہتا ہے کہ حضرت خضر بشر تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت خضر دونوں نے اہلِ قریہ سے غذا کی خواہش کی تھی جیسا کہ جمع کے صیغے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے کہ وہ دونوں بھوکے تھے، دونوں کو احتیاجِ غذا تھی۔ اگر حضرتِ خضر واقعی فرشتہ ہوتے تو وہ احتیاجِ غذا سے یقیناً مستغنی ہوتے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے جب تلا ہوا بچھڑا فرشتوں کی ضیافت میں پیش کیا تو وہ اس وجہ سے دست کش رہے کہ احتیاجِ غذا سے وہ فطرتاً مستغنی تھے۔ اس سے بھی یہی قرینہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت خضر بشر تھے۔ فرشتہ نہ تھے۔

بے قصور لڑکے کی ہلاکت صرف حضرت موسیٰ جیسے حاملِ شریعت ہی کے لیے باعثِ حیرت اور موجبِ اذیت نہ تھی بلکہ ہر سلیم الفطرت انسان کی نظر میں بھی اس کی قباحت واضح تھی مگر حکمِ الٰہی مل جانے کے بعد بجز تعمیلِ حکم کے کوئی گنجائش ہی کہاں تھی۔ یا اسی طرح حضرت ابراہیم اپنی چہیتی اولاد کو حکمِ الٰہی کا اشارہ پاتے ہی ذبح کرنے پر آمادہ ہو گئے اور اپنی اُس شریعت کا سہارا لے کر کوئی عذرِ شرعی پیش کرنے پر تامل تک نہ ہو سکے جس کی رُو سے ناکردہ گناہ اولاد کا قتل گناہِ عظیم ہے۔

دونوں بزرگوں نے تعمیلِ حکمِ الٰہی کی پیش رفت میں جس جرأت مندانہ انداز میں اجتناب شریعت سے اجتناب فرمایا اس سے تو بظاہر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ معمولاً احکامِ شریعت کی پابندی لازم ہے، مگر جب کسی شخص کو کسی امرِ خاص میں بطورِ خاص براہِ راست حکمِ الٰہی مل جائے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ احکامِ شریعت

سے صرف نظر کر سکے۔

ان بزرگانِ محترم کے طرز عمل، اور اندازِ فکر کو ملحوظ رکھ کر متاخرین کی کاوشِ فکر سے ہم آہنگ ہونے پر طبیعت نہ تو راضی ہوتی ہے اور نہ حضرت خضر کی بشریت کا انکار کرنے پر مائل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عام تو ہر شے کو محیط ہے مگر جب اللہ تعالیٰ اپنی کسی رحمتِ خاص کا ذکر "اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا" اور "وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا" کے الفاظ میں فرماتا ہے تو اس کی رحمت کی نوعیت اور وسعت تقریباً اسی پیمانہ کی محسوس ہوتی ہے جو بعض نبی یا رسول کے لیے "وَاٰتَیْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا" کے الفاظ میں منشور پائی جاتی ہے۔ میری حد علم تک ہر سہ آیاتِ مندرجۂ بالا کسی فرشتہ کے حق میں کبھی نازل نہیں ہوئیں۔ اور جب کسی خوش نصیب انسان سے یہ آیات متعلق ہوتی ہیں تو ان کی تعبیر و تفسیر میں نبوت یا رسالت کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ اگر یہ تاویل قابلِ قبول ہو تو پھر حضرت خضر صرف بشر ہی نہ تھے بلکہ نبی یا رسول بھی ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی فردِ انسان کو اپنے کسی خاص علم و معرفت سے نوازنا چاہا ہے اور کوئی فرشتہ اس کا واسطہ قرار پایا ہے تو خود فرشتہ ہی کو حاضرِ خدمت کیا گیا ہے، حاملِ وحی و الہام کو نقلِ مقام کی زحمت نہیں دی گئی اور نہ وہ خود ایسے فرشتے کی جستجو میں نکلا۔ واللہ اعلم

مندرجۂ بالا جو قرائن خدمتِ گرامی میں پیش کیے گئے ہیں ان میں سے ہر قرینہ باعثِ خلش بنا ہوا ہے۔ اس کو دور کرنے کے لیے آپ ہی کو زحمتِ تفہیم دینے کے سوا چارہ نہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ جو دینی فکر و فہم اللہ نے آپ کو مرحمت فرمایا ہے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں۔ دوسرے یہ کچھ مناسب بھی نہیں کہ قیاس و گمان غالب تو آپ کا ہو اور استفسار کسی دوسرے سے کیا جائے۔

**جواب** ۔ میں نے حضرت خضر کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ محض قیاس اور میلان ہی کی حد

تک ہے قطعی طور پر جزم و یقین کے ساتھ نہ میں یہ کہتا ہوں کہ وہ بشر تھے، نہ یہی کہتا ہوں کہ وہ غیر بشر تھے۔ آپ اس کے ہرگز پابند نہیں ہیں کہ میرے اس قیاس اور میلان کو قبول کریں۔ آپ کا اطمینان اگر اس بات پر ہو کہ وہ بشر ہی تھے تو اس میں کوئی مضایقہ نہیں۔

آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ قرآن مجید نے جس طرح یہ قصہ بیان کیا ہے اس سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ وہ انسان تھے۔ لیکن جو چیز ان کو انسان ماننے میں تأمل کی موجب ہے وہ ان کے وہ کام ہیں جو قوانینِ شرعیہ کے خلاف پڑتے ہیں، یعنی کشتی والوں کی کشتی میں چھید کر دینا، اور ایک بے گناہ لڑکے کو کسی گناہ کے صدور سے پہلے اندیشۂ گناہ کی بنا پر قتل کر دینا۔ اس معاملہ میں اگر حضرت خضر کی بشریت کی تصریح اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں کر دی ہوتی تو ہم نوعِ انسانی کے لیے خدا کے احکام کی دو قسمیں تسلیم کر لیتے۔ ایک قسم کے احکام وہ جو شریعت میں مذکور ہیں۔ اور دوسری قسم کے احکام وہ جو براہِ راست کسی بندے پر شریعت کے خلاف نازل ہوں۔ لیکن چونکہ بالفاظ صریح حضرت خضر کی بشریت کو قرآن میں بیان نہیں کیا گیا ہے، اور کوئی دوسری نظیر بھی قرآن میں ایسی نہیں ملتی جو انسان کے لیے احکام خداوندی کی دو قسموں کی طرف اشارہ کرتی ہو، اس لیے مجھے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس محسوس ہوتی ہے کہ حضرت خضر کو غیر بشر مانا جائے۔

آپ نے حضرت ابراہیمؑ کے قصے سے جو استدلال کیا ہے وہ درست ہوتا اگر فی الواقع آنجناب اپنے صاحبزادے کو ذبح کر دیتے۔ اس صورت میں ہم یہ مان لیتے کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو شریعت کے خلاف بھی حکم دیتا ہے۔ لیکن قصۂ ابراہیمی میں اوّل تو صاف حکم یہ نہیں دیا گیا تھا کہ تم اپنے بیٹے کو ذبح کر دو بلکہ خواب میں ذبح کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا، اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ اللہ نے فعل ذبح واقع نہیں ہونے دیا۔ اس لیے یہ واقعہ احکام خداوندی کی اس دوگونہ تقسیم کے لیے دلیل نہیں بن سکتا۔

آپ کا یہ استدلال بھی صحیح نہیں ہے کہ جو کام انسانوں کے کرنے کے ہیں وہ فرشتے انجام

نہیں دیتے، اس لیے کشتی کا توڑنا اور لڑکے کو قتل کرنا لامحالہ انسان ہی کا کام ہونا چاہیے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جو کام انسانوں کے لیے ناجائز ہیں وہ فرشتوں کے لیے ناجائز نہیں ہیں انسان کسی کے مال کو شرعی حق کے بغیر نقصان پہنچاتے یا کسی بے گناہ انسان کو قانون کے خلاف قتل کردے تو یہ گناہ ہے۔ مگر فرشتے احکامِ قضاؤ قدر کے تحت روزانہ لاکھوں انسانوں کو مختلف بے شمار طریقوں سے ہلاک، اور آئے دن آفات ارضی وسماوی کے ذریعہ سے انسانی املاک کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ اسی تدبیر خداوندی پر سے ذرا سا پردہ ہٹا کر حضرت موسیٰ کو دکھایا گیا کہ کارکنان قضاء و قدر کس طرح کن مصلحتوں کے تحت اپنا کام کر رہے ہیں، اور انسان کے لیے، خواہ وہ حضرت موسیٰ جیسا عظیم انسان ہی کیوں نہ ہو، اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا کتنا مشکل ہے

حضرت موسیٰ اور خضر کے غذا طلب کرنے سے بھی بشریت خضر پر استدلال درست نہیں قرآن میں یہ تصریح نہیں ہے کہ حضرت خضر نے حضرت موسیٰ کے ساتھ واقعی کھانا کھایا تھا۔

حضرت خضر کے لیے اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا کے الفاظ بلاشبہ اُن الفاظ سے مشابہ ہیں جو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ارشاد ہوتے ہیں، اور کسی فرشتے کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال ہونے کی کوئی نظیر قرآن میں نہیں ہے۔ لیکن ان الفاظ کی بنا پر حضرت خضر کا نبی و رسول ہونا تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہوتا اگر قصۂ خضر میں کشتی خراب کرنے اور لڑکے کو قتل کر دینے کا واقعہ مذکور نہ ہوتا۔ ان دو واقعات کی موجودگی میں نبوتِ خضر تسلیم کرنے کے بعد تو یہ ماننا لازم آجاتا ہے کہ کوئی نبی اُس شریعت کے خلاف بھی احکام پا رہا ہے جو خدا نے اپنے تمام انبیاء کو دی ہے۔ اتنی بڑی بات مان لینے کے لیے صرف یہ امر کافی نہیں ہے کہ حضرت خضر کے لیے رحمتِ خاص اور علم خاص عطا کیے جانے کا ذکر قرآن میں ایسے طریقے سے آیا ہے جو انبیاء کو حکم اور علم عطا کیے جانے کے ذکر سے مشابہ ہے۔ اسی طرح اتنی بڑی بات اس دلیل سے بھی نہیں مانی جا سکتی کہ فرشتے کو حضرت موسیٰ کے پاس بھیجنے کے بجائے حضرت موسیٰ کو فرشتے کے پاس بھیجنا ایک غیر معمولی طریق کار ہے۔

آپ کا یہ گمان بھی صحیح نہیں ہے کہ حضرت خضر کو فرشتہ قرار دینا "متاخرین کی کاوش فکر ہے"۔
اس کا علم تو مجھے نہیں کہ آپ کا اشارہ کن متاخرین کی جانب ہے، البتہ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ متقدمین میں بھی اس معاملے میں بہت اختلاف رہا ہے کہ حضرت خضر رسول ہیں یا نبی، فرشتہ ہیں یا کوئی ولی، اور آیا وہ زندہ ہیں یا نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر حافظ ابن حجر نے فتح الباری (شرح بخاری، جلد اول، کتاب العلم، باب ذھاب موسیٰ فی البحر) میں اس اختلاف کا مجملاً ذکر کیا ہے اور آگے چل کر کتاب الانبیاء میں دوبارہ فرمایا ہے وحکی السھیلی عن قوم انہ کان ملکا من الملٰئکۃ ولیس من بنی آدم "سہیلی نے ایک گروہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ خضر علیہ السلام ملائکہ میں سے تھے، بنی آدم میں سے نہ تھے"۔

---

انگریزی نظامِ تعلیم کا اساسی تخیل

# لارڈ میکالے کی تاریخی یادداشت کا

# ترجمہ اور اس پر تبصرہ

عبدالحمید صدیقی

شائع کردہ : روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی۔ بی، ون ایریا ۱/۹
لیاقت آباد کراچی

انڈیا میں : مکتبہ تجلی، دیوبند، یو۔ پی
یا کتب خانہ انجمن ترقی اردو۔ جامع مسجد دہلی سے طلب فرمائیے

---

# مطبوعات

ثنوی سرّ الاسرار | تالیف: ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل صاحب۔ صدر شعبہ فلسفہ جامعہ راجشاہی (مشرقی پاکستان)۔ شائع کردہ: ۶/۱۷ پی۔ آئی۔ بی کالونی، کراچی نمبر ۵۔ صفحات ۲۶۴ قیمت آٹھ روپے

رستم اور سہراب کے درمیان معرکہ اگرچہ ایک قصۂ پارینہ ہے لیکن ہر دور میں اپنے لیے عبرت کا سامان رکھتا ہے۔ ہم عملی زندگی کے ہر گام پر اس قسم کے معرکے سر کرتے رہتے ہیں۔ بسا اوقات ہم ایک دوسرے کے بالکل قریب رہ کر بھی نہ صرف آپس میں بُعد اور بیگانگی محسوس کرتے ہیں بلکہ ناواقفیت کے عالم میں ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھ بھی جاتے ہیں۔ اسی قسم کی کیفیت ہمیں اس کتاب میں دکھائی دیتی ہے۔ کتاب کے فاضل مصنف فلسفہ اور تصوف پر گہری نظر رکھتے ہیں اور انہوں نے بڑے عالمانہ انداز میں ڈاکٹر اقبال کے فلسفۂ خودی پر گرفت کی ہے لیکن ہمیں افسوس سے یہ بات کہنا پڑتی ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر اقبال کے جن خیالات پر گرفت کی ہے ڈاکٹر مرحوم نے اُن سے ہمیشہ براءت کا اظہار کیا ہے۔ مثال کے طور پر فاضل مصنف نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے:

"ہمارا مقصد اس ثنوی کو لکھنے سے یہ ہے کہ ہم لوگوں کو اس راستہ پر جانے سے روکنا چاہتے ہیں جو خودی کی طرف لے جاتا ہے اور جس کے ڈانڈے دانستہ یا نادانستہ طور پر خود بینی اور خودسری سے مل جاتے ہیں۔"

پھر خودی کی تعلیمات کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

"بہت کم لوگ اس حقیقت سے خبردار ہو سکے ہیں کہ اقبال کی تعلیمات سے جہاں بے شمار فوائد حاصل ہوئے وہاں بے راہ روی کا دروازہ بھی کھل گیا نوبت

یہاں تک پہنچ گئی کہ اب ہر شخص گویا "خودی کو بلند" کرنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کے کلام سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اُن کے نزدیک خودی، خودنمائی، خودسری اور کبر و نخوت کے ہم معنی ہے اور اُن کی تعلیمات نے لوگوں کے اندر ایک غلط قسم کا پندار پیدا کیا۔ اُن کی تعلیمات سے یہ معنی اور نتیجہ اخذ کرنا انصاف کے منافی ہے۔

ڈاکٹر اقبال پیغمبر نہ تھے کہ وہ ہر چھوٹی بڑی لغزش سے یکسر پاک اور منزہ ہوتے۔ اُن کا کلام ایک عام انسان کا کلام ہے اس لیے اُن کے قلم سے کئی ایک باتیں ایسی نکل گئی ہیں جن سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً مسئلہ ارتقاء کے متعلق علامہ مرحوم کی رائے پر فاضل مصنف نے جو گرفت کی ہے اس میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے، لیکن ان سب حقائق کو نگاہ میں رکھنے کے باوجود ہمارا تاثر یہ ہے کہ اقبال مرحوم کی تعلیمات کے ساتھ بعض مقامات پر صریح زیادتی کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے سب سے پہلے علامہ مرحوم کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جو فی الواقع ان کا مقام نہیں اور پھر اُن پر گرفت شروع کی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں پروفیسر صاحب نے خودی کے رد میں اپنے بعض اشعار بھی درج کیے ہیں اُن کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو:

لے نہ میرے سامنے نامِ خودی
کتنا خوں آشام ہے جامِ خودی
کام لے عقل و خرد سے کام لے
تھام لے مستوں کا دامن تھام لے
خرد کو اوصافِ خودی سے پاک کر
چاک کر قلب و جگر کو چاک کر
ذات سے اپنی پرے ہو کر بھی دیکھ
اپنی ہستی کو ذرا کھو کر بھی دیکھ

(ع - ح - ص)

**نظامِ اسلامی مشاہیرِ اسلام کی نظر میں** | مرتبہ: خلیل احمد حامدی۔ ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔ ضخامت: ۵۰۴ صفحات۔ قیمت: ساڑھے چھ روپے۔

کتاب کا نام دیکھ کر یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید اس کتاب میں نظامِ اسلامی کے بارے میں مشاہیرِ اسلام کی آراء جمع کی گئی ہونگی اور اس کی نوعیت پراپیگنڈے کی ہو گی لیکن کتاب کی ورق گردانی کرتے ہی یہ مغالطہ کافور ہو جاتا ہے۔

فاضل مرتب جناب خلیل احمد حامدی صاحب نے اس کتاب میں نظامِ اسلامی کے عملی و نظری مسائل پر عالم اسلام کے مشاہیر علماء کے لکھے ہوئے بیش قیمت مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں فقہ و قانون سے متعلق مضامین رکھے گئے ہیں جو سب کے سب اچھی تحقیقی نوعیت کے حامل ہیں۔ دوسرے باب میں ریاست و حکومت سے متعلق نہایت اہم موضوعات پر وقیع مضامین جمع کیے گئے ہیں مثلاً "اسلام میں بنیادی انسانی حقوق۔" "اسلامی حکومت میں ملازموں کے حقوق و فرائض" "اسلام کا بلدیاتی نظام" "اسلام کے اصول معاہدات" "اسلام کا بین الاقوامی قانون" اور "اسلام کا نظام تعزیر" وغیرہ۔ تیسرے باب میں اسلامی نظام کے قیام کا راستہ روکنے کے لیے مغرب جو کوششیں کر رہا ہے اور جن حیلوں سے کام لے رہا ہے ان کا جائزہ لیا گیا ہے اور ان کے حملوں کا دفاع کیا گیا ہے۔

بیشتر مضامین چونکہ عرب مشاہیر کے تحریر کردہ ہیں۔ اس لیے فاضل مرتب نے ان کا ترجمہ کر کے انہیں کتاب میں شامل کیا ہے۔ ترجمے کا معیار خاصا بلند اور زبان شگفتہ ہے۔ ہر مضمون سے پہلے صاحبِ مضمون کا ایک مختصر تعارفی خاکہ بھی پیش کیا گیا ہے جس نے کتاب کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہماری رائے میں مرتب محترم اور ناشر نے یہ کتاب پیش کر کے اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ کتاب کے اگلے ایڈیشن میں کتاب کا معیار طباعت بہتر بنایا جائے اور اسے اغلاط سے پاک

کیا جائے۔

قافلۂ سخت جاں | مصنف: اسعد گیلانی۔ ناشر: ادارہ ادب اسلامی ۲۲ - اے سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا ضخامت: ۴۰۰ صفحات قیمت اعلیٰ ایڈیشن چھ روپے۔ سستا ایڈیشن چار روپیہ

ادب کا ایک معتد بہ اور بیش قرار حصّہ وہ ہے جو جیل کی وحشت ناک تنہائیوں میں لکھا گیا ہے۔ اس کی وجوہ تو اور بھی بہت سی ہو سکتی ہیں لیکن دو بڑی وجہیں آسکر وائلڈ کے الفاظ میں یہ ہیں کہ "جیل خانے میں وقت آگے نہیں بڑھتا۔ کولہو کے بیل کی طرح چکّر کاٹتا رہتا ہے، ایک نقطے کے گرد ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی میں روح کش جمود اور سکوت طاری ہو جاتا ہے"۔ اور "جیل میں آ کے خیالوں کی دنیا پر جمود طاری ہو جاتا ہے ـــ خیالوں پہ نہیں خیالوں کی دنیا پہ ـــ خیالوں میں تو بھونچال آجاتے ہیں مگر خیالوں کی دنیا میں کوئی جنبش نہیں ہوتی جو واردات برسوں گزرے ہوئی تھی اور جسے میں نے بڑی آسانی سے فراموش کر دیا تھا آج ذہن کے نہ جانے کون سے گوشے سے اُبھر کر پھر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے اور اس کی تمام تفصیلات میری آنکھوں تلے بکھر گئی ہیں۔ بھولی بسری یادیں پھر سے یاد آگئی ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ میں لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ ۔ ۔"

وقت کا ٹھیراؤ اور زندگی کا سکوت و جمود، اور خیالوں کے بھونچال، یہی دو سبب ہیں جو کسی کو جیل میں لکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ چنانچہ جنوری ۱۹۶۴ء میں جب اسعد صاحب لائل پور جیل میں پہنچے تو اپنے لیے جہاں اور بہت سی مصروفیات انہوں نے پیدا کیں وہاں ایک مصروفیت تحریر کی بھی رکھی۔ روداد اسیری لکھی، اپنے قافلے کے ساتھیوں کے تعارف لکھے زندانیوں کا پروگرام لکھا، روداد چمن کے عنوان سے اجتماع لاہور کا حال لکھا اور پھاٹک کھلنے تک جو جو کچھ پیش آتا گیا لکھتے گئے۔ خیالوں کے ہر بھونچال کو قلم سے کاغذ پر منتقل کرتے گئے۔

یہ کتاب خطوط کا مجموعہ ہے جس میں انہوں نے عبارت آرائی کے بجائے سیدھے سادے تاثراتی انداز میں اپنے خیالات رقم کیے ہیں۔ مخاطب ان خطوط کا "خاموش طبع دور افتادہ چھوٹے

سے قصبے کا رہنے والا تحریک اسلامی کا ایک فعال اور مستعد نوجوان کارکن ہے۔ یہ کوئی متعین شخصیت نہیں ہے بلکہ اسلامی انقلاب کے قافلے کا ہر نوجوان ان مکاتیب کا مخاطب ہے۔"

## پڑھنے والوں کی رہنمائی کے لیے ایک بنیادی فہرست
## اُردو میں
## بچوں کی کتابیں

مرتبہ و شائع کردہ: قومی کتاب مرکز پاکستان
تھیوسوفیکل ہال۔ بندر روڈ۔ کراچی ما

قومی تعلیم کے مسائل میں بچوں کی تعلیم کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ مشکل ہے۔ بچپن میں جو نقوش انسانی ذہن پر مرتسم ہو جاتے ہیں، وہ گویا بنیاد ثابت ہوتے ہیں اور بعد میں اس کی زندگی جو پیرایہ بھی اختیار کرتی ہے، ان نقوش کا اثر اس میں ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ماں باپ، ماحول اور اساتذہ کے برابر برابر اثر ان کتابوں کا بھی بچے کے ذہن اور اخلاق پر پڑتا ہے جو وہ بچپن میں پڑھتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جن لوگوں نے اپنے بچپن میں علامہ اقبال کی نظمیں اور مولانا حالی کی نعتیں پڑھی ہیں، ان کا نقطۂ نظر بقیہ زندگی میں ان لوگوں سے قطعی مختلف ہوگا جو اپنے بچپن میں "ایک ننھا لڑکا ٹوٹ بٹوٹ" اور "گٹو گرے" پڑھ کر جوان ہوئے ہیں۔ ہمارے بزرگ بچوں کی تعلیم میں ابتدائی نقوش کی اسی اہمیت کو محسوس کرتے ہوتے، ان کی تعلیم کا آغاز قرآن کریم گلستان، کریما اور مامقیما سے کرتے تھے۔

منہج تعلیم کے بعد، والدین اور اساتذہ کے لیے کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب سے پچاس سال قبل تک ایک بندھا نصابِ تعلیم تھا جو عام طور پر سبھی بچے پڑھا کرتے تھے لیکن اس نصاب تعلیم کی تقریباً ساری ہی کتابیں فارسی میں ہوتی تھیں۔ اب جبکہ فارسی کی جگہ اُردو نے لے لی ہے، کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ زیادہ بڑھا ہو گیا ہے۔

درسی کتابوں کے علاوہ بچوں کو اضافی مطالعے کے لیے بھی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس طرح ان میں مطالعے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ جن بچوں کو مطالعے کا شوق ہو جاتا ہے وہ بالعموم آوارہ گردی سے محفوظ

رہتے ہیں۔ لیکن یہاں پھر کتابوں کے انتخاب کا مسئلہ آکھڑا ہوتا ہے۔ فضول قسم کے بے سر و پا قصّے کہانیاں اور انگریزی کاکوں کے طرز کی کتابیں بچّوں کے ذہنوں پر ناخوشگوار اثر ڈالتی ہیں۔

ہمیں ازحد خوشی ہے کہ قومی کتاب مرکز پاکستان نے اردو زبان میں بچّوں کی کتابوں کے انتخاب کے مسئلے کا لحاظ کیا اور والدین اور اساتذہ کی رہنمائی کے لیے یہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی۔ زیرِ نظر کتاب اس فہرست کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں اسلامیات، تاریخ، سیرت و سوانح، روزمرہ سائنس، معلومات اور مشاغل، قصّے کہانیاں، لطیفے اور کھیل اور بچوں کی نظموں پر مجموعاً ۱۲۸۲ کتابوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس سلیقے، محنت اور خوبصورتی کے ساتھ یہ کتاب مرتب اور طبع کی گئی ہے، اس سلیقے، محنت اور خوبصورتی کے ساتھ ہمارے ملک میں بہت کم کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ مرتبین نے اس فہرست میں کتاب کا نام، مصنف یا مترجم کا نام، ناشر، سنِ اشاعت ضخامت، سائز، قیمت اور طباعت کی نوعیت (آفسٹ یا لیتھو وغیرہ) غرض یہ کہ تمام ممکن تفصیلات فراہم کی ہیں۔ اس کے علاوہ جن جن ناشروں کی کتابوں کو فہرست میں شامل کیا ہے، ان کے مکمل پتے علیحدہ سے دیئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں مصنفین اور مترجمین کا اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ (ع۔ ق)

---

# ضروری اعلان

ترجمان القرآن کے منصب رسالت نمبر کی صرف چند کاپیاں دفتر میں موجود ہیں۔ خواہشمند حضرات ... سے تین روپے کی بجائے صرف دو روپے فی کاپی کے حساب سے (مع محصول ڈاک) طلب کر سکتے ہیں۔

مینجر ترجمان القرآن

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کا سلسلہ

از ابو سلیم محمد عبدالحیٔ

## ایمان کی اہمیت

- ایمان کیا ہے ؟
- دین میں ایمان کی کیا اہمیت ہے ؟
- کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے ؟
- دین کا شعور اور ایمان و یقین بخشنے والی کتاب
- بچوں اور عورتوں کے لیے نہایت مفید کتاب

قیمت ۲ روپے

## اسلام کی تعلیم

- اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں ؛
- اسلامی عبادات کیسے انجام دی جائیں ؛
- ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے ؟

—— اس کتاب میں ——

اِن سوالوں کا اطمینان بخش جواب ملے گا

قیمت ۱/۷۵ روپے

## دین کی حفاظت

- خواتین کی اصلاح و تربیت کیلئے بیش قیمت کتاب
- دین کی حفاظت و بقا کیلئے خواتین کی ذمہ داری
- فسادِ معاشرہ میں خواتین کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تدابیر

قیمت ۱/۷۵ روپیہ

## دین کی خدمت

- دین کی خدمت کیوں کی جائے اور کیسے ؟
- اس کام کی ضروری شرائط کیا ہیں ؟
- غیر اسلامی نظام سے مومن کا تعلق ۔
- اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کا حل ۔
- آسان اور شگفتہ اندازِ بیان ۔ قیمت ۲/۲۵ روپے

## دین کی باتیں

- دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے ؟
- اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں ؟
- اسلام کی بنیادی عبادات اور انکی ضروری تفصیلات
- آسان اور عام فہم زبان میں

قیمت ۲ روپے

## تبلیغ کی حکمت

- تبلیغ کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے ؟
- داعی کی ضروری صفات کیا ہیں ؟
- مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیسے کیا جائے ؛
- دعوتِ دین پیش کرنے کا سلیقہ ؛

قیمت ۱/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور